خدا کی بستی کے مظلوم
عوام کا ترجمان

مدیر
وہاب صدیقی

۴-۱۱ اکتوبر ۱۹۷۳ء
قیمت :— ۷۵ پیسے
ہوائی ڈاک سے : ایک روپیہ

ہفت روزہ
الفتح

جلد :- ۴ — شمارہ :- ۲۱

ادارئیے

گفتن زمن تو کار بستن

پاکستان پیپلز پارٹی کے برسرِ اقتدار آتے ہی الفتح نے لکھا تھا "حکومتی عہدے الگ پارٹی عہدے الگ"۔ اس تجویز کی ایوانِ اقتدار نے پرواہ نہ کی تاہم کارکنوں کی سطح پر اسے زبردست حمایت حاصل ہوئی، حکومتی عہدوں پر فائز حضرات کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے اشک شوئی کے لئے راولپنڈی میں ایک کل پاکستان کنونشن بُلا لیا۔ اس کی حیثیت جی حضوریوں کے اجتماع سے زائد نہ تھی، شیخ رشید، میر رسول بخش خان تالپور اور جیکب آباد کے عبدالنبی نے اس موقع پر جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے چند باتیں کہہ دی تھیں جو صدا بصحرا ثابت ہوئیں اور اس طرح یہ کنونشن حکومتی عہدوں کی جانب سے پیش ہونے والی قراردادوں کو منظور کر کے اپنے انجام کو پہنچا۔

یہ کنونشن کارکنوں میں پھیلی بے چینی اور ان کی صحیح سوچ کو روکنے میں بری طرح ناکام ہوا۔ حکومتی اور پارٹی عہدوں پر بیک وقت قابض افراد نے ایک بار پھر غلطی کی اور ہر اس کارکن کو پارٹی کی صفوں سے نکال باہر کیا، جس نے اختلاف کیا، نکتہ چینی کی یا پھر بعنوان ارباب بست و کشاد کی لوٹ مار میں حصہ دار بننے سے انکار کیا ان ... پھروں کو انتہا پسند کے خطاب سے نوازا گیا، اس پر ہی اکتفا نہیں ہوا بلکہ ان پر جھوٹے مقدمے بنائے گئے، پابندِ سلاسل کیا گیا اور جیلیں ان کا مقدر ٹھہریں۔

ان حالات میں پارٹی کے کارکنوں کا معیار یہ رہ گیا کہ جو کسی وزیر یا اسمبلی رکن کے زیادہ کاسہ لیس ہیں وہی صفِ اوّل کے کارکن ہیں، حکومت

خاص مضامین

سرورق : انور سمیع
عکاس : گرینگو

فون : ۴۱۲۲۷۴

ارشاد راؤ پبلشر نے حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح، ۸ ڈی۔ فرسٹ کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ سے شائع کیا

کے اندر بدعنوانیوں نے پارٹی کے اندر بدعنوانیوں کو تقویت پہنچائی چونکہ بدعنوانیوں، اقربا پروری اور لوٹ مار کے خلاف مزاحمت کرنے والوں کو پہلے ہی ٹھکانے لگا دیا گیا تھا، لہٰذا پارٹی اور حکومت دونوں کے درمیان بدعنوانیاں ہی گہرا رشتہ بن گئیں۔

ایوان اقتدار میں پھر محسوس کیا گیا کہ پارٹی کا وجود پارہ پارہ ہو رہا ہے پارٹی ہی نہ رہی تو حکومت کیسے رہے گی لہٰذا ایک بار پھر دلاسہ دیا گیا کہ پارٹی کے انتخابات ہوں گے پنجاب اور سندھ میں کمیٹیوں کو نامزد کر دیا گیا کہ ان کی نگرانی میں انتخابات ہوں گے۔ ان سے پہلے پنجاب میں پارٹی کے صدر شیخ رشید تھے اور سندھ میں میر رسول بخش تالپور، بعض لوگوں نے اس موقع پر بھی کہا تھا کہ یہ کمیٹیاں شیخ اور میر کو کنارے لگانے کے لئے قائم کی گئی ہیں۔ اصل میں پرنالہ اپنے مقام پر ہی گرے گا۔ پنجاب میں افضل وٹو کے خلاف ردِ عمل ہوا اور یہ خاصا شدید تھا تاہم سندھ میں سید قائم علی شاہ کی ذات پہلے ہی کی طرح غیر متنازعہ رہی اور سندھ میں اس تبدیلی سے اچھی توقعات وابستہ کی گئیں۔

اب پنجاب میں افضل وٹو نے تمام دفاتر بند اور نئے سرے سے شناختی کارڈ کے اجراء کے احکامات کے ذریعے ان شکوک و شبہات کو درست قرار دیدیا ہے جن کا اظہار شیخ رشید اور میر رسول بخش تالپور کو دونوں صوبوں کی پارٹیوں کی سربراہی سے سبکدوشی کے وقت کیا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں برملا کہا جا رہا ہے کہ پیپلز پارٹی کا "تیا پانچا" ہونے والا ہے مخلص کارکنوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہی اور جو ابھی بھی پُر امید ہیں وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔

پنجابی کی ایک مثال ہے "ڈُلھے بیراں دا کجھ نئیں جاندا" (بیروں کے بکھرنے سے نقصان نہیں ہوتا) اس مثال کے مطابق پیپلز پارٹی کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے اور بیروں کی طرح بکھرا پڑا ہے، ہمیں یقین ہے کہ اس عالم میں بھی وزیراعظم بھٹو کو یہ اطلاعات پہنچائی جا رہی ہوں گی کہ سب اچھا ہے، انتہا پسندوں کو نکالنے کے لئے کارروائی کی گئی ہے۔

سب اچھا نہیں ہے، یہ بہت بُرا ہے جو پارٹی کارکنوں کی قربانیوں کے نتیجے میں برسرِاقتدار آئی، اب اس کی ساکھ گر رہی ہے وزیراعظم بھٹو جو خود پارٹی کے چیرمین بھی ہیں، ریاستی امور میں اس قدر مصروف ہیں کہ انہیں پارٹی کے کاموں کے لئے یقیناً وقت نہیں ملتا۔ ابھی وقت ہے کہ پیپلز پارٹی حکومتی اور پارٹی کے عہدوں کو الگ الگ کر دے۔ وزیراعظم بھٹو کو ان خوشامدیوں اور کاسہ لیسوں سے نجات حاصل کر لینا چاہیے، وہ صرف ریاستی امور سے واسطہ رکھیں اور پارٹی کی چیئرمینی سے مستعفی ہو کر بیگم نصرت بھٹو کو پارٹی کا چیف آرگنائزر مقرر کر دیں۔

بیگم نصرت بھٹو کی ذات ابھی تک سب کے لئے قابل احترام رہی ہے، ویسے بھی ان منافقوں سے بخوبی واقف ہیں اور ان میں تنظیمی صلاحیتیں موجود ہیں۔ پیپلز پارٹی میں اب جو لوگ رہ گئے ہیں، ان میں سے صرف اور صرف بیگم صاحبہ پر ہی لوگ اعتماد کر سکتے ہیں، ورنہ دوسروں پر کھلی عدالت میں مقدمے چلائے جائیں تو ان کے اصل چہرے بے نقاب ہو جائیں گے۔

؎ گفتن زمن تو کار بستن۔



بھارت، عراقی فضائیہ کو تربیت دے رہا ہے



خلیج فارس اور مشرقِ وسطیٰ میں پاک بھارت ڈپلومیٹک جنگ

مغربی محاذ پر سکوت طاری ہے۔ توپیں خاموش ہیں گولیوں اور بموں کی آوازیں نہیں آتیں لیکن ڈپلومیسی کے محاذ پر جنگ جاری ہے پاکستان اور بھارت ابھی تک ڈپلومیٹک حملوں اور ان کے دفاع میں مصروف ہیں۔ پاکستان کے خلاف بھارت کی جس ڈپلومیٹک جنگ کی ابتدا قیام پاکستان کے فوراً بعد ہوئی اس کا مقصد پاکستان کے وجود کو ختم کرنا تھا یہ ڈپلومیٹک جنگ آج بھی جاری ہے۔

بھارت نے اپنی ڈپلومیٹک جنگ کی حکمت عملی کے مطابق ۲۶ سال میں پاکستان پر تین جنگیں مسلط کیں ۴۸ء اور ۱۹۶۵ء میں بھارت کو منہ کی کھانی پڑی، البتہ دسمبر ۷۱ء کی جنگ کا اختتام پاکستان کے عوام کے لئے ایک عظیم المیہ ثابت ہوا بھارت اپنی ڈپلومیسی کی بدولت پاک افواج سے دو دو ہاتھ کئے بغیر پاکستان کا ایک بازو توڑنے میں کامیاب ہوگیا۔

دہلی سمجھوتے کے بعد اگرچہ پاکستان اور بھارت پرامن بقائے باہمی کے نئے دور کا آغاز کر چکے ہیں۔ روایتی دشمنی کے جذبات اور ہنر آزمائی کی باتیں ختم ہو چکی ہیں لیکن راکھ تلے چنگاریاں سلگ رہی ہیں دونوں ملکوں کے درمیان ڈپلومیسی کے محاذ پر جنگ ہو رہی ہے دونوں تیل کی دولت سے مالا مال خلیج کی ریاستوں اور مشرقِ وسطیٰ پر اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی مہم میں مصروف ہیں تاکہ نئے دوست بنائے جائیں اور پرانے اتحادیوں سے روابط مضبوط کئے جائیں۔

مسلم ریاست ہونے کی وجہ سے ابتداء میں پاکستان مشرقِ وسطیٰ میں ڈپلومیٹک محاذ پر کامیاب رہا۔ لیکن جب پاکستانی حکمرانوں نے سامراجی معاہدوں کے طوق کو اپنے گلے میں سجایا تو بھارت کو اپنا کام دکھانے کا موقع ملا پنڈت نہرو اور جمال ناصر نے مشرقِ وسطیٰ "بھارت عرب تعاون" کی بنیاد ڈالی بھارت نے مصر سے متعدد معاہدے کئے اور ایک معاہدے کے تحت بھارتی فضائیہ کے افسروں نے مصر کے ہوا بازوں کو قاہرہ میں تربیت دی پنڈت نہرو اور جمال ناصر کے انتقال نے بھارتی ڈپلومیسی کی بساط الٹ دی اور مصر نے متوازن پالیسی اپنائی۔

اس وقت مشرقِ وسطیٰ میں بھارت کا سب سے بڑا حلیف عراق ہے جو سوویت یونین کا فوجی اتحادی بھی ہے بغداد اور دہلی تعلقات اس وقت مزید مضبوط ہوگئے جب گذشتہ موسم بہار میں بھارت اور عراق نے "معاشی، فنی اور سائنسی تعاون" کے معاہدوں پر دستخط کئے ان معاہدوں کی ایک شق منظر عام پر نہیں لائی گئی اس شق میں کہا گیا ہے۔

"بھارتی فضائیہ کا ایک مشن عراقی ہوا بازوں کو روسی ساخت کے میگ ۲۱ اڑانے کی تربیت دے گا۔ یہ طیارے سوویت یونین نے عراق کو سپلائی کئے ہیں"

دہلی کے حکمرانوں نے عراق کو ۴۰ لاکھ ڈالر کا بھارتی ساختہ اسلحہ سپلائی کر کے بغداد کو اپنے چنگل میں اچھی طرح جکڑ لیا ہے۔ عراق سوویت یونین اور بھارت کا اتحادی ہونے کی وجہ سے ان کی پالیسیوں پر سر تسلیم خم کر رہا ہے یہی وجہ ہے کہ عراق مشرقِ وسطیٰ کا پہلا مسلم ملک ہے جس نے بنگلہ دیش کو تسلیم کیا اور یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اسی ملک کے سفارتخانہ واقع اسلام آباد سے روسی اسلحہ درآمد ہوا۔

عراق کو اپنے چنگل میں جکڑنے کے بعد بھارتی حکمرانوں نے خلیج فارس کی ریاستوں کی طرف قدم بڑھایا اور اومان کے سلطان کو "فوجی تعاون" کی پیش کش کی اس موقع پر ایران اور پاکستان دونوں نے مداخلت کی اور اومان کے سلطان کو بھارتی شرائط سے بہتر بنیادوں پر فوجی تعاون کی پیش کش کی۔

پاکستان بھی مشرقِ وسطیٰ اور خلیج فارس میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لئے کوشش کر رہا ہے "نیوز ویک" مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۷۳ء کے مطابق پاکستان بھی مشرقِ وسطیٰ اور خلیج فارس کی ریاستوں سے "فوجی

اسلام آباد، مغربؓ کی بجائے مشرق سے مددلے

تعاون" کر رہا ہے سعودی عرب کی فضائیہ میں پاکستانی ہوا باز ملازم ہیں اور سعودی عرب کے ہوا بازوں کو تربیت بھی دے رہے ہیں، کویت میں پاکستانی ہوا باز موجود ہیں۔ ابو دوبئی میں پانچ ہزار پاکستانی فوج موجود ہے لیبیا اور اردن نے بھی پاکستانی فوجی مشیروں کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔

تیل کی دولت سے مالا مال خلیج کی ریاستوں اور مشرق وسطیٰ میں پاک، بھارت، ڈپلومیٹک جنگ کا ذکر کرنا اس لئے ضروری تھا کہ اس کے پس منظر سے آگاہ ہونے کے بعد ہی وزیر اعظم مسٹر بھٹو کے حالیہ دورۂ امریکہ کی اہمیت اور نتائج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے امریکہ کا مفادات اس میں ہے کہ خلیج فارس میں سوویت اثر بڑھنے نہ پائے تاکہ امریکہ کو خلیج فارس کے تیل کی سپلائی برقرار رہے جنوبی ایشیا میں جغرافیائی اعتبار سے پاکستان کی حیثیت بہت اہم ہے یہاں سے خلیج فارس کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے چنانچہ وزیر اعظم بھٹو نے اپنے دورۂ امریکہ کے دوران نیویارک میں کہا کہ "کچھ لوگ نقشہ کو نہیں دیکھتے ہم پاکستانی واقعی خلیج فارس کے دہانے پر موجود ہیں اگر کوئی طاقت اسے (خلیج فارس) کنٹرول کرنا چاہتی ہے تو اس کے لئے لازمی ہے کہ وہ پاکستان کا تعاون حاصل کرے یا تابعداری کرے۔ مشرق وسطیٰ کے حالات امریکہ کو تیل سے مالا مال علاقے میں پاکستان کا کردار تسلیم کرنے پر مجبور کر دیں گے۔"

وزیر اعظم بھٹو نے صدر نکسن سے معاشی اور فوجی امور پر گفتگو کی تھی۔ اور کہا تھا کہ ہمیں صرف فاضل پرزے نہیں چاہئیے بلکہ ہمیں سرخ اور گرم ہتھیاروں کی ضرورت ہے "معاشی امداد تو مل گئی۔ لیکن فوجی امداد کا معاملہ الجھن میں پڑ گیا ہے اور مسٹر بھٹو نے اس پر زور بھی نہیں دیا بقول مسٹر بھٹو" میں کانگریس کا موڈ جانتا ہوں اور اپنے دوستوں کے لئے مشکلات پیدا نہیں کرنا چاہتا" حقیقت یہ ہے کہ کانگریس اسلحہ کی سپلائی میں رکاوٹیں پیدا کر رہی ہے لیکن فنانشل ٹائمز آف لنڈن کا خیال ہے کہ صدر نکسن نے مسٹر بھٹو کو کسی نہ کسی شکل میں اسلحہ دینے کا یقین دلایا ہوگا۔ اس کا یہ تجزیہ برصغیر کے ممالک کے لئے اسلحہ کی فراہمی کی موجودہ امریکی پالیسی پر مبنی ہے اس پالیسی کے حوالے سے امریکی وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کیسنگر نے کہا تھا۔

"جنوبی ایشیا کے لئے امریکہ سب سے بڑا اسلحہ فراہم کرنے والا فریق نہیں بن سکتا۔ لیکن اس کا مطلب نہیں کہ امریکہ پاکستان کی سلامتی میں دلچسپی نہیں رکھتا، اور اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ روس کے ساتھ مصالحت کا یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ جنوبی ایشیا کے معاملات میں امریکہ کی دلچسپی کم ہو گئی ہے۔"

لیکن امریکی ہفت روزہ "ٹائمز" مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۷۳ء کے مطابق صدر نکسن پاکستان کو اسلحہ دینے پر رضامند نہیں ہوئے وہ لکھتا ہے کہ "وزیر اعظم بھٹو اور صدر نکسن کے درمیان ہونے والی گفتگو اس معنیٰ میں ناکام ثابت ہوئی کہ امریکہ پاکستان کو اسلحہ دینے پر رضامند نہ ہوا جب کہ پاکستان کو ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ کے دوران

باقی صفحہ ۲۵ پر

بھارت 11000 افغانی گوریلوں کو تربیت دے رہا ہے

افغان حکومت ماسکو کے مشورے کے بغیر کوئی کارروائی نہیں کرتی !!

ندیم نمائندہ "الفتح" مقیم کابل

افغانستان کے "جمہوری انقلاب" کو دو ماہ سے زائد کا عرصہ گذر گیا۔

اس عرصے میں افغانستان نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ یہ سب ہی جانتے ہیں۔ شاہ ظاہر شاہ کے زمانۂ اقتدار میں روسیوں اور بھارتی ہندوؤں اور سکھوں کو لاتعداد مراعات حاصل تھیں لیکن ان مراعات میں اب مزید اضافہ ہو گیا ہے، افغانستان کے ہر شعبۂ زندگی میں روسیوں کا عمل دخل ہے۔ افغان حکومت روسی مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتی۔

جمہوریت کے نام پر معصوم افغانی عوام کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ سڑکوں پر جگہ جگہ "ژوندی دی وی افغان جمہوریت" یعنی زندہ باد افغان جمہوریت کے بڑے بڑے کتبے لگے ہوئے ہیں۔ ریڈیو پر دن رات جمہوریت کے گن گائے جاتے ہیں۔ اخبارات میں روزانہ بڑے بڑے مضامین شائع کئے جاتے ہیں، جن میں مصنفین جمہوریت کی خوبیاں بیان کرتے ہیں لیکن حالت یہ ہے کہ موجود افغان حکومت کے خلاف کہا ہوا ایک لفظ آپ کو غیر معینہ مدت کے لئے جیل بھیج سکتا ہے۔ جمہوریت کے نفاذ کے لئے تین اصول بے حد ضروری ہیں۔

۱۔ حزبِ مخالف۔

۲۔ انتخابات۔

۳۔ تحریر و تقریر کی آزادی۔

اب دیکھیں کہ افغانستان میں ان تین اصولوں پر کس حد تک عمل درآمد ہو رہا ہے، جہاں تک حزبِ مخالف کا تعلق ہے، افغانستان کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ یہاں کسی زمانے میں بھی حزبِ مخالف کا کوئی وجود نہیں رہا۔ یہاں برسرِ اقتدار طبقہ اپنے خلاف ایک لفظ سننا گوارہ نہیں کرتا۔ یہاں کوئی مخالف پارٹی نہیں ہے اور نہ اس کے قیام کی اجازت ہے۔ طالب علموں میں روس اور چین کی حامی پارٹیوں کا وجود پایا جاتا تھا لیکن اب صرف روس کی حامی پارٹی میدان میں رہ گئی ہے۔ چین کی حامی پارٹی "شعلۂ جاوید" پر پابندی عائد کر دی گئی ہے اور اس کے لیڈر حضرات ان دنوں جیل کی ہوا کھا رہے ہیں۔ ملاؤں کا طاقتور گروپ امریکہ کا حامی بتایا جاتا ہے لیکن موجودہ حکومت نے ان میں سے سینکڑوں کو جیل میں ڈال دیا ہے۔ اور ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ سینکڑوں برس کی بادشاہت نے افغانستان کے عوام کو اس حد تک بزدل بنا دیا ہے کہ وہ اپنے حقوق کے حصول کے لئے ایک لفظ اپنی زبان سے ادا نہیں کر سکتے۔ وہ جمہوریت سے قطعی ناآشنا ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی موجودہ حکومت جمہوریت کے نام پر بدترین آمریت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے، ایک طرف کہا جاتا ہے کہ یہ فوجی حکومت ہے اور دوسری طرف جمہوریت کے گن گائے جاتے ہیں، افغانستان کے ہر شہر اور ہر صوبے کا سربراہ فوجی ہے۔ ہر شعبے اور ہر محکمے میں فوجیوں کو اعلیٰ اسامیوں پر فائز کیا گیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ افغانستان کی تمام عدالتوں کا نظام ملک کے سربراہوں کے ہاتھوں میں ہے ایک حالیہ آرڈی ننس کے مطابق ملک کے ہر فرد پر مقدمہ چل سکتا ہے لیکن کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ملک کے سربراہ کو کسی عدالت میں گھسیٹ لائے۔ یہ افغانستان کی جمہوریت ہے۔

اب آئیے انتخابات کی طرف، سردار محمد داؤد نے جب سے عنانِ حکومت سنبھالی ہے انہوں نے ایک بار بھی ملک میں عام انتخابات کرانے کی کوئی بات نہیں کی، وہ خود ملک کے صدر اور وزیرِ اعظم بن بیٹھے ہیں، انہیں یہ اختیار کس نے دیا ہے اس بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ شاہ ظاہر شاہ کے زمانہ اقتدار میں ایک لولی لنگڑی اسمبلی کا وجود تھا لیکن اب یہ اسمبلی بھی معطل کر دی گئی ہے۔ دوسری اسمبلی کب وجود میں آئے گی؟ اس سوال کا جواب کوئی نہیں جانتا۔ جب میں پاکستان میں تھا تو لوگ افغانستان میں پائی جانے والی ارزانی کے قصّے سنا سنا کر مجھے خوابوں کی دنیا میں لے جاتے تھے لیکن یہاں آکر میرے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ افغانستان شاید ایشیا کا گراں ترین ملک ہے۔ آپ یقین کریں کہ یہاں مرغی کے ایک انڈے کی قیمت ۱۲ آنے ہے، گوشت ۱۲ روپے سیر بھی نہیں ملتا۔ یہاں چاول اور گندم پاکستان سے اسمگل ہوتی ہے۔ جب پاکستان میں ان چیزوں کی قلت ہوتی ہے تو یہاں بھی دور دور تک ان کا نشان نہیں ملتا، افغانستان کی اپنی معیشت نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ افغانستان ایشیا کا سب سے پس ماندہ ملک ہے۔ یہاں آکر پہلی بار احساس ہوتا ہے کہ کوئی ہم سے بھی زیادہ پس ماندہ ہے۔ یقین کیجئے ہمارا ملک افغانستان کے مقابلے میں جنت ہے، وہاں لوگ اپنے حقوق کے حصول کے لئے پولیس کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں لیکن یہاں ایسی کوئی روایت نہیں۔ وہاں شہری آزادیوں کے لئے سول نافرمانیوں کی تحریک چل سکتی ہے لیکن یہاں اس بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا، وہاں اخبارات کی آزادی کے لئے اخبارات کی ہڑتال ہو سکتی ہے لیکن یہاں کوئی آزاد اخبار نہیں ہے۔ اس کے باوجود کسی اخبار میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ وہ اس کے خلاف آواز اٹھا سکے۔ وہاں سربراہِ مملکت کا ڈرامے کی صورت میں

مذاق اڑایا جاتا ہے، لیکن کوئی یہاں ایسا کر کے دیکھے، پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد کرنے والے افغانستان کی مدد کے خواہاں ہیں۔ کیا کہنے!

جہاں تک آزادیٔ تقریر و تحریر کا تعلق ہے، افغانستان میں جمہوریت کا یہ تیسرا اصول سرے سے موجود ہی نہیں، یہاں کوئی اخبار آزاد نہیں۔ معمول سے معمولی خبر سنسر ہوتی ہے۔ افغانستان کے انقلاب سے قبل "کاروان" نام کا ایک آزاد اخبار تھا جو کبھی کبھار حکومت کی ناقص پالیسیوں پر تنقید کیا کرتا تھا لیکن اب "جمہوریت" کے دور میں اسے بھی بند کر دیا گیا ہے۔ ظاہر شاہ کے دورِ اقتدار میں بھی یہ اخبار عتاب کا شکار رہتا تھا، وقتاً فوقتاً اسے بند کر دیا جاتا تھا لیکن اب جمہوری حکومت میں تو اسے سرے سے بند ہی کر دیا گیا ہے۔ وزارتِ اطلاعات کی پیشگی اجازت کے بغیر قتل اور چوری کی معمولی خبر بھی کسی اخبار میں شائع نہیں ہو سکتی، یہاں کوئی نیوز ایجنسی نہیں، ایک ملکی نیوز ایجنسی باختر پریس کے نام سے موسوم ہے، لیکن اس میں اسٹاف نہ ہونے کے برابر ہے، ساری خبریں ریڈیو افغانستان سے مستعار لی جاتی ہیں۔ اور ریڈیو افغانستان کی خبریں بی بی سی اور وائس آف امریکہ کی مرہونِ منت ہوتی ہیں۔ ایک مقامی اخبار کے ایڈیٹر نے مجھے بتایا کہ کسی ذرائع سے ان کے پاس جلّی کے انقلاب کی چند تصویریں آ گئیں، وہ انہیں اپنے اخبار میں شائع کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وزارتِ اطلاعات نے یہ کہہ کر تصویریں تلف کر دیں کہ ان کی اشاعت سے افغانستان میں انقلاب کی راہ ہموار ہو جائے گی۔

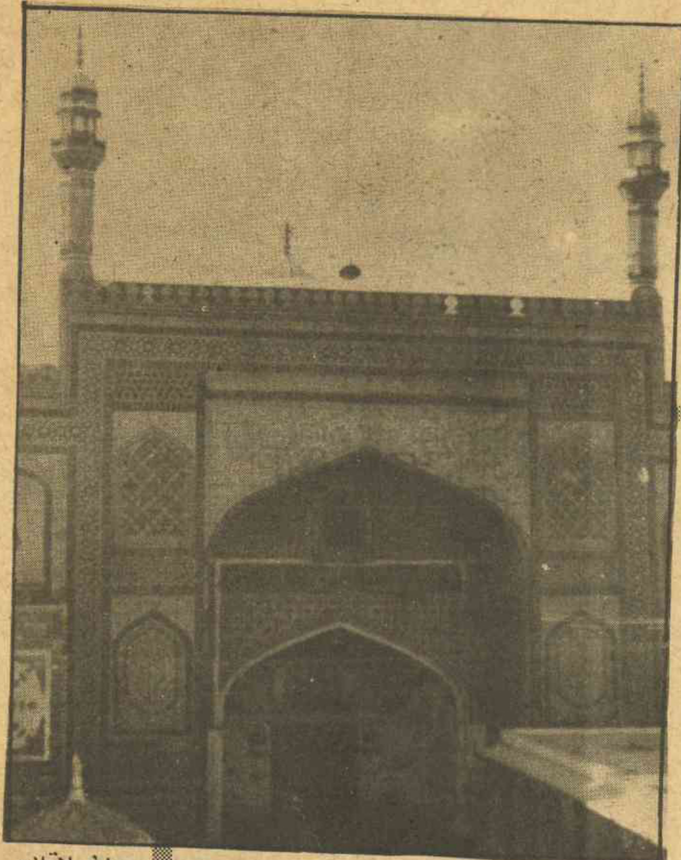
افغانستان میں سب سے زیادہ چھپنے والے اخبار کی تعدادِ اشاعت دس ہزار سے زائد نہیں، اس پر طرہ یہ کہ چار صفحات پر مشتمل اس اخبار کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ دنیا کے دیگر ممالک کے برخلاف یہاں لوگوں کو اخبارات پڑھنے کی قطعی کوئی عادت نہیں، افغانستان کے عوام آمرانہ نظام سے اس حد تک خائف ہیں کہ بازاروں اور ہوٹلوں کا تو ذکر ہی کیا لوگ اپنے گھروں میں بھی سیاست پر بحث کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

افغانستان کی موجودہ حکومت ان دنوں بڑھتی ہوئی قیمتوں سے خاصی پریشان ہے۔ عوام میں سخت بے چینی پھیل رہی ہے۔ اکّا دکّا جلسے اور جلوسوں کی خبریں بھی آ رہی ہیں۔ حال ہی میں قندھار اور ہرات کے شہروں میں موجودہ حکومت کے خلاف زبردست جلسے ہوئے جن میں مقررین نے موجودہ حکومت پر دل کھول کر تنقید کی۔ افغانستان میں اس قسم کے جلسے اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک بالکل نیا واقعہ ہے۔ چنانچہ پولیس نے ان جلسوں میں شرکت کرنے والے عوام کی ایک بڑی اکثریت کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا ہے۔ جیلوں کا ذکر چل نکلا ہے تو اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی سن لیجئے، جو افغانستان میں بڑا مشہور ہے۔

امیر امان اللہ کے زمانے میں ایک بار قیدیوں کی چھانٹی ہو رہی تھی۔ امیر امان اللہ ایک ایک قیدی کو بلاتے اور اس سے پوچھتے کہ اسے کس جرم کی سزا میں قید میں ڈال دیا گیا ہے، ایک قیدی سے جب پوچھا گیا کہ وہ کون ہے تو اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔ جناب میں سترھواں ہوں۔ امیر امان اللہ بڑے حیران ہوئے۔ انہوں نے پوچھا کہ سترھویں سے اس کی کیا مراد ہے؟ اس نے جواب دیا جناب ایک بار پولیس کے سپاہی سترہ قیدیوں کو کہیں لے جا رہے تھے۔ کہ ایک قیدی چپکے سے کہیں کھسک گیا۔ پولیس والے بڑے پریشان ہوئے۔ ان کی پریشانی دیکھنے کے لئے ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ میں بھی اس ہجوم میں شامل تھا۔ پولیس والوں نے مجھے یہ کہہ کر گرفتار کر لیا کہ چلو میں ہی سترھواں ہوں"۔

افغانستان میں جمہوریت کی کتنی مٹی پلید ہو رہی ہے اس کی تفصیل میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ افغانستان معاشی بدحالی کا شکار ہے ملک کا خزانہ خالی ہے۔ عوام فاقے کر رہے ہیں لیکن افغانی حکومت کے عزائم جنگجویانہ ہیں۔ پاکستان کے خلاف اس کی نفرت میں، روز بروز اضافہ ہو رہا ہے روس اور بھارت اس کی نفرت کو مزید ہوا دے رہے ہیں۔ سردار داؤد محمد کے برادر سردار محمد نعیم حال ہی میں روس کا دورہ کر کے اب بھارت کے دورے پر روانہ ہو چکے ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ ان دونوں ممالک میں پاکستان کے خلاف تخریبی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کے لئے کاوشیں ہو رہی ہیں اور پروگرام بن رہے ہیں۔ تقریباً ۱۱ ہزار افغانی فوجی ان دنوں بھارت میں گوریلا جنگ کی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ تربیت پاکستان کے خلاف استعمال ہو گی اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اب اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈر روس اور بھارت سے مل کر پاکستان کو مزید ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ میں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ رہا ہوں۔ وقت آنے پر میری یہ تحریر ثبوت کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے، افغانستان میں رہنے والے تقریباً تمام پاکستانیوں کو اس حقیقت کا بخوبی علم ہے حکومت پاکستان نے اگر اب بھی اس جانب توجہ نہ دی اور بدستور افغانستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو یہ پاکستان کے مفاد میں نہیں ہو گا۔ نیشنل عوامی پارٹی کے مفرور جنرل سیکرٹری اجمل خٹک کا بھرپور یقین کے ساتھ یہ کہنا کہ پختونستان اسی سال وجود میں آ جائے گا، اپنے اندر بڑی گہرائی رکھتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پاکستان کے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹانا روسی سوشل سامراج کی بنیادی پالیسیوں میں سے ایک پالیسی ہے، چین کے ساتھ پاکستان کی بڑھتی ہوئی دوستی اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

چند دنوں سے ریڈیو افغانستان مستقل پروپیگنڈہ کر رہا ہے کہ افغانستان میں موجودہ حکومت کا تختہ الٹنے کی ایک سازش پکڑی گئی ہے جس میں پاکستان کا ہاتھ ہے، یہ سارا چکر سردار داؤد کے برادر سردار محمد نعیم کے دورۂ روس اور دورۂ بھارت کے بعد شروع ہوا ہے، حکومت الٹنے کا بہانہ وہیں ترتیب دیا گیا ہے تاکہ پاکستان سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی جائے اور کسی مناسب وقت پر چھیڑ چھاڑ محاذ آرائی کی شکل میں تبدیل کر دی جائے۔ ہر ذی ہوش شخص جانتا ہے کہ پاکستان ان دنوں خود ذاتی مشکلات میں گھرا ہوا ہے کہ اسے کسی دوسرے ملک کے اندر تخریبی سرگرمیوں کی ذرا بھی فرصت نہیں لیکن افغان حکومت کو کوئی کیسے سمجھائے۔ اس کی آنکھوں پر تو پاکستان کے خلاف نفرت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک مسلم ملک کے خلاف افغانستان محاذ آرائی پر اترا ہوا ہے۔ ہندوؤں اور سوشل سامراجیوں نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو منجمد کر دیا ہے۔



لال شہباز قلندر
کا مزار

○ تھانے کے منشی نے اپنی جیب سے ایک قیمتی ہار نکال کر ایک رقاصہ کے گلے میں ڈال دیا۔ بھلا ایکسائز انسپکٹر کیوں چپ رہتا اس نے بھی اپنی پسند کی رقاصہ کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی پہنا دی ○

پردہ چاک

• الفتح رپورٹ •

اس کے تقدس کو کس نے پامال کیا؟

محکمہ اوقاف کے افسر نے ناچ گانے کی اجازت دیدی

دو رقاصہ پائلوں کی جھنکار پر رقص کر رہی تھیں۔ طبلے کی تھاپ اور گلے کی آواز سے اس جگہ بیٹھے ہوتے لوگ مست تھے۔ انہیں اس بات کا مطلق ہوش نہ تھا کہ وہ کہاں بیٹھے ہیں۔ کس جگہ کھڑے ہیں۔ گانے کی آواز سُن کر اِدھر اُدھر گھومنے والے بھی اکٹھے ہو رہے تھے۔ چند لوگ تو مستی کے عالم میں ایسی حرکتیں کر رہے تھے جنہیں کوئی شریف آدمی پسند نہیں کر سکتا۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایسی مقدس جگہ کی حرمت کو پامال کرنے کی اجازت کسطرح دیدی گئی؟

آپ حیران ہوں گے کہ میں کہاں کا ذکر لے کر بیٹھ گیا ہوں۔ لیکن میں اپنے ذہنی اور روحانی کرب میں آپ کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ آپ اس بات کا بخوبی اندازہ کر سکیں کہ اس پاک سرزمین میں کس طرح جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر لگائے جا رہے ہیں۔ راشی نوکر شاہی اپنا زہر پھیلا کر کس طرح پورے معاشرے کو زہر آلود کرنے میں مصروف ہے۔ ہر طرف بدعنوانی اور بدکاری کا چرچا ہے۔ لوگوں کے زرد چہرے بڑھتے ہوئے سیلاب بلا سے خوفزدہ ہیں۔ ان کے گھروں کے ٹوٹے ہوئے دروازوں میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ اس طوفان کو روک سکیں۔

رقاصہ نوٹوں کی بارش میں رقص کر رہی تھیں۔ اور لوگ کیف و نشاط کے عالم میں جھوم رہے تھے۔ اس واقعہ پر ایک غیرت مند شہری مشتعل ہو گیا، اور اس نے جب رقص و سرور کی یہ محفل الٹنے کی کوشش کی تو چند اوباش لوگوں نے اس کی پٹائی کر دی۔ اس کی قمیص پھاڑ دی۔ اس کے چہرے کو زخمی کر دیا، اور اچھی طرح زدوکوب کرنے کے بعد اسے اس جگہ سے بھگا دیا گیا۔

یہ المناک واقعہ سیہون شریف کا ہے، جہاں گزشتہ

زائرین کو روح فرسا ڈرامہ دیکھنے پر مجبور کیا گیا

دنوں سندھ کے ممتاز روحانی مبلغ اور صوفی شاعر حضرت لعل شہباز قلندرؒ کے عرس کی سالانہ تقریبات منعقد ہوئی تھیں، جہاں ہر سال ہزاروں افراد انہیں عقیدت کے پھول نچھاور کرنے جاتے ہیں۔ اپنے زخموں کا مرہم تلاش کرنے اس جگہ جا پہنچتے ہیں۔ اور حضرت کی توسط سے بارگاہِ الٰہی میں خیر و برکت کی دعائیں مانگتے ہیں۔ لیکن محکمہ اوقاف کے چند راشی افسروں نے چند سکوں کی خاطر اس جگہ حیا سوز سرگرمیوں کی اجازت دے کر اپنے گھناؤنے کردار کو ننگا کر دیا۔

ابھی رقاصہ کے رقص کا سلسلہ جاری تھا کہ وہاں سیہون شریف پولیس اسٹیشن کے ایک منشی اور ایکسائز کے انسپکٹر پہنچ گئے۔ دونوں شراب کے نشہ میں چور تھے۔ آواز میں لکنت تھی اور قدم ڈگمگا رہے تھے۔

ان کے پہنچتے ہی نوٹوں کی بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ زیادہ تر لوگ خاموشی سے تماشہ دیکھ رہے تھے، جبکہ چند "شرفا" جنہیں اگلی نشست میں جگہ دی گئی تھی۔ دس دس روپے کے نوٹ نچھاور کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پولیس اسٹیشن کے منشی اور ایکسائز انسپکٹر نے جب دیکھا کہ دس روپے والے نوٹوں سے بات نہیں بنے گی تو وہ پچاس روپے کے نوٹ رقاصاؤں پر نچھاور کرنے لگے۔ ظاہر ہے اس کے بعد دوسرے "شرفاء" نے پسپائی اختیار کر لی۔ انہوں نے اب صرف تحسین و آفرین کے لچر جملوں اور داودوں پر اکتفا کیا۔ منشی اور انسپکٹر نے فاتحانہ انداز سے مجمع پر نظریں ڈالیں اور رقیبوں کے حوصلے پست کرنے کے لئے آخری بار نوٹوں کی گردش تیز کر دی رقاصاؤں کے لئے ایسا موقع بار بار کہاں ملتا ہے۔ انہوں نے بھی ناز و انداز کے جتنے بھی تیر اپنے ترکش میں رکھ چھوڑے تھے ان پر خالی کر دیئے۔ اس طرح ایک چشم دید گواہ کے مطابق دونوں نے کم و بیش ہزاروں روپے اس محفل پر لٹا دیئے۔

منشی تو اتنا خوش تھا کہ اگر آج اس کے پاس قارون کا خزانہ ہوتا تو وہ بھی لٹا دیتا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک قیمتی ہار نکال کر ایک رقاصہ کے گلے میں ڈال دیا۔ بھلا انسپکٹر کیوں چپ رہتا۔ اس نے بھی اپنی پسند کی رقاصہ کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی پہنا دی۔ بھوکے ننگے لوگ بادشاہوں اور نوابوں کے دور کا یہ روح فرسا ڈرامہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔

منشی اور ایکسائز انسپکٹر نے لوگوں کی غیرت کو للکارتے ہوئے اخلاق سوزی کا بھی مظاہرہ کیا، جس پر چند نوجوان ناراض ہو گئے، اور انہوں نے خبردار کیا کہ وہ حد سے آگے نہ بڑھیں۔ منشی اور انسپکٹر نے رنگ میں بھنگ پڑتے دیکھ کر چراغ پا ہو گئے۔ نشہ کے عالم میں ننگی اور فحش گالیاں دینی شروع کر دیں۔ انسپکٹر کے ہاتھ میں بید کی پتلی سی چھڑی تھی، اس نے جنون کے عالم میں آگے کھڑے ہوتے لوگوں کو چھڑی سے مارنا شروع کر دیا، جس سے اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔

اس شرمناک واقعہ کے عینی شاہدوں میں صحافیوں کے علاوہ صوبائی وزیر خوراک جناب عبداللہ شاہ کے چھوٹے بھائی بھی شامل تھے۔ ایک صحافی کے مطابق کچھ معزز لوگوں نے صوبائی وزیر کے چھوٹے بھائی کو اس شرمناک ڈرامہ کی اطلاع دی اور انہیں اس جگہ لے گئے تاکہ بعد میں اس جگہ کے تقدس کو پامال کرنے والے اپنے جرم سے انکار نہ کر دیں۔

عرس میں شرکت کرنے والوں کو جب اس شرمناک واقعہ کی اطلاع ملی تو ان میں غم و غصے کی شدید لہر دوڑ گئی۔ لیکن اس سے قبل کہ یہ واقعہ دوسرا رخ اختیار کرتا، منشی اور ایکسائز انسپکٹر کا نشہ ہرن ہو گیا اور وہ اس جگہ سے فرار ہو گئے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ منشی اور ایکسائز انسپکٹر کے پاس اتنی خطیر رقم کہاں سے ہاتھ لگ گئی جو اس بیدردی سے وہ طوائفوں پر نچھاور کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں ایک اطلاع کے مطابق چند روز پیشتر بدمعاشوں کے ایک گروہ نے ایک نوجوان اور خوبرو عورت کو اغوا کر لیا تھا۔ بعد میں ان ملزموں کو گرفتار کر لیا گیا، لیکن ان سے ایک موٹی رقم وصول کر کے چھوڑ دیا گیا۔ اغوا کی واردات میں ملبوس سارے ملزم دیدہ دلیری سے سیہون کی سڑکوں پر دندناتے ہوتے گھوم رہے ہیں۔ منشی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے یہ رقم انہی ملزموں سے ملی تھی۔

ایکسائز انسپکٹر کے بارے میں جو اطلاعات ملی ہیں ان کے مطابق اس نے عرس کے دوران چرس کے اڈے چلانے کی کھلی اجازت دے دی تھی۔ اس کے عوض چرس کے خفیہ کاروبار کرنے والوں کی جانب سے اسے اچھی خاصی رقم ملی تھی۔ اگر منشی اور انسپکٹر پر یہ الزامات غلط ہیں، تو انہیں اتنی رقم کہاں سے ملی تھی۔؟ یہ بات اپنی جگہ تحقیق طلب ہے۔ کیونکہ پولیس اسٹیشن کے معمولی منشی اور ایکسائز انسپکٹر کی تنخواہ اتنی نہیں ہوتی ہے کہ وہ گھنٹے دو گھنٹے کی تفریح پر ہزاروں روپے لٹا دیں۔

چند ماہ پیشتر محکمہ اوقاف کی جانب سے بزرگوں کے عرس کے موقع پر چرس اور افیون کے استعمال اور ناچ گانوں پر پابندی کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن اس اعلان کو صرف کاغذی پابندیوں تک محدود رکھا گیا۔ عملاً کہیں بھی اس کا نفاذ نہ ہوا۔ اس کی زندہ مثال سندھ کے صوفی شاعر حضرت لعل شہباز قلندرؒ کے سالانہ عرس کی تقریبات ہیں، جہاں دھوم دھڑکے سے چرس کی خرید و فروخت ہوتی رہی اور طوائفیں اپنے فن کا کمال دکھاتی رہیں۔ اس واقعہ سے زائرین

باقی صفحہ ۳۱ پر

پولیس اسٹیشن کے منشی اور ایکسائز انسپکٹر نے ہزاروں روپے لٹا دیئے

بدعنوانیوں
کا شکار
ہونیوالوں کی
داستان

PRESIDENT'S SECRETARIAT (PUBLIC)
PRESIDENT'S HOUSE, RAWALPINDI

No.D 360 - Pet(P)/72

Dated 21-2-72

ACKNOWLEDGEMENT

Received petition dated 21.2.72 submitted to the President by ~~Mr/Mrs/Miss~~ Mohd Sadiq

Section Officer

صدارتی سیکرٹریٹ میں محمد صادق
کی درخواست کی وصولی کی رسید



محمد صادق

چوکیدار نے مظلوم کو دھکے دے کر گیٹ سے باہر نکال دیا

چوہدری ظہور الٰہی کی انسان دوستی کا بھانڈہ پھوٹ گیا

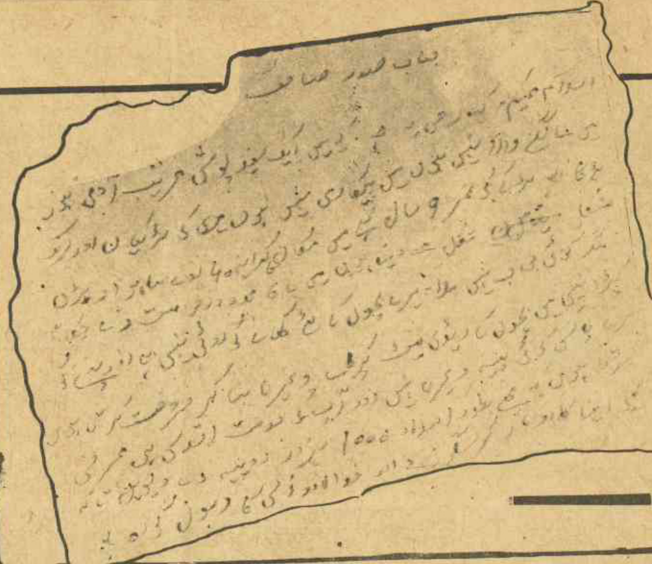
—— عالم زیب مرزا

آپ نے یہ خبر پڑھی ہوگی کہ راولپنڈی کے عبدالعزیز نے بھوک، بیماری اور مسلسل بے روزگاری سے تنگ آکر خودکشی کرلی، وہ زندگی میں ایک ٹین آٹے کے لئے ترستا رہا۔ اس کی موت کے بعد محلے والوں نے اس کی تجہیز و تکفین کے لئے تین ہزار روپے کی رقم جمع کی۔ اس کی المناک خودکشی کی خبر جب کونسل مسلم لیگ کے رہنما اور پنجاب کے بڑے جاگیردار چودھری ظہور الٰہی تک پہنچی تو وہ اپنے نرم صوفے پر بیٹھے بیٹھے تڑپ اٹھے، انہوں نے فوری طور پر پیش کش کی کہ میں عبدالعزیز کی بیوہ، ایک بچی، اور خواہر نسبتی کی کفالت کروں گا۔ اگر اس معاشرے میں کوئی اور عبدالعزیز مصائب کا شکار ہے تو وہ خودکشی نہ کرے بلکہ میرے پاس آئے، میں اس کی مدد کروں گا۔"

معاشرے کی ناانصافیوں کا شکار دوسرا عبدالعزیز محمد صادق ان کی کوٹھی پشاور روڈ پر چلا گیا اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے لرز رہے تھے اور اس کا دل کانپ رہا تھا۔ وہ حالات سے مجبور ہو کر زندگی میں پہلی بار سوالی بن کر ایک دولت مند کی کوٹھی پر پہنچا تھا۔ اس کے دل میں یہ احساس جاگزیں تھا کہ اس دنیا میں اب بھی ایسے متمول لوگ موجود ہیں جو دکھی انسانیت کی خدمت اپنا فرض سمجھتے ہیں، یہ دھرتی جس روز ایسے دردمندوں سے خالی ہو جائے اس دن قیامت آ جائے گی۔

گیٹ پر چوکیدار نے اسے روک لیا۔ اس نے کانپتی آواز میں اپنی دکھ بھری داستان سنائی تو چوکیدار نے اپنی مونچھوں پہ تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "چودھری صاحب کس کس کی مدد کریں گے۔ پاکستان تو ننگے بھوکوں سے بھرا پڑا ہے۔ جاؤ جاکر اپنا کام کرو۔ جیسے دیکھو اپنا منہ اٹھائے ادھر چلا آتا ہے"۔ محمد صادق پر یہ باتیں سن کر بجلی گر پڑی۔ وہ یہاں کیا سوچ کر آیا تھا اور اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آ رہا تھا۔ اسی دوران چودھری ظہور الٰہی برآمدے میں نمودار ہوئے، انہوں نے معاملہ کو بھانپ لیا۔ چوکیدار کو سر کے اشارے سے کچھ ہدایات دیں اور اندر چلے گئے۔ چوکیدار سمجھ گیا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ پہلے تو اس نے زبانی دھمکی دی کہ "جاؤ، جاؤ۔ صاحب نہیں ملے گا۔" لیکن جب خالی دھمکی سے محمد صادق نے دردمند دل رکھنے والے رہنما چودھری ظہور الٰہی کے آہنی گیٹ کی جالیاں نہ چھوڑیں تو خونخوار چوکیدار اس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اور اسے دھکے دیتا ہوا گیٹ سے باہر نکال دیا۔ وہ اپنی لمبی لمبی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے غرایا۔ "اگر پھر تم یہاں آئے تو تمہیں رسی سے باندھ کر پٹائی کی جائے گی۔"

پچاس سالہ محمد صادق راولپنڈی کینٹ کے جنوب مغرب میں علاقہ ڈھوک بھاٹہ میں رہتا ہے، اس کی بیوی کے علاوہ پانچ لڑکیاں اور ایک نو سال کا لڑکا ہے۔ وہ جس مکان میں رہتا ہے، اس کا کرایہ چالیس روپے ماہوار ہے۔ اس کی بیوہ اور لڑکیاں محلے میں محنت مزدوری کر کے کرایہ ادا کرتی ہیں۔ محمد صادق کباڑی کے گرم اور ٹھنڈے کپڑے خرید کر بچوں کے سوٹ تیار کرتا تھا۔ اور پھر انہیں



صدر پاکستان کے نام محمد صادق کی اپیل کا عکس

بیروزگاری اور فاقہ کشی نے اسے ٹی بی میں مبتلا کردیا

پھیری لگا کر فروخت کرتا تھا۔ لاگت سے زیادہ جو رقم ملتی تھی، اس سے اپنے اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ اس کی زندگی محنت و مشقت سے عبارت تھی۔ عزت کی روٹی کے لئے اسے دن رات کام کرنا پڑتا تھا۔ مگر وہ خوش تھا۔ کیونکہ وہ محنت کی کوکھ سے پیدا ہوا تھا۔ البتہ جوان بیٹیوں کا غم اسے ہر وقت ستاتا رہتا۔ ہر وقت اسی خیال میں غرق رہتا کہ کوئی معقول لڑکا مل جائے تو اپنی سب سے بڑی لڑکی کے ہاتھ پیلے کردے۔

کچھ عرصہ قبل اسے ایک لڑکا مل گیا جس سے اس نے اپنی لڑکی کا رشتہ طے کردیا۔ اس نے جو تھوڑی بہت رقم پس انداز کی تھی لڑکی کے جہیز پر خرچ کردی، اس شادی نے اس کی زندگی میں بے پناہ تلخیاں گھول دیں۔ اس کا داماد اپنی بیوی کو لے کر کراچی چلا گیا۔ وہاں اس نے لڑکی پر بے پناہ ظلم و تشدد شروع کردیا۔ اس نے لڑکی کو مجبور کیا کہ وہ اپنا جسم فروخت کرے۔ لیکن غریب محمد صادق کی لڑکی اس پر آمادہ نہ ہوئی۔ ان باتوں کا جب علم محمد صادق کو ہوا تو وہ بہت پریشان ہوا۔ اس نے اپنے داماد کو خط لکھا اور کچھ لوگوں کے ذریعہ پیغام بھجوایا: "ہم سخت غریب ہیں، مگر عزت کی روزی پر ایمان رکھتے ہیں۔ خدارا آپ میری لڑکی کو تنگ نہ کریں۔ وہ آپ کی خادمہ ہے، اور آپ کو اس کا حق ادا کرنا ہے۔ محنت مزدوری کریں، اور تھوڑا کھائیں۔"

اس خط کا اس کے داماد پر الٹا اثر ہوا۔ اس نے اس کی لڑکی کو مار پیٹ کر اس کے تمام کپڑے اور زیورات چھین لئے۔ اور اسے گھر سے دھکا دے کر نکال دیا۔ وہ کئی روز تک در در کی خاک چھانتی رہی۔ بالآخر کسی نہ کسی طرح وہ راولپنڈی پہنچ گئی۔ اور تمام سرگزشت اپنے والد کو سنائی، کچھ عرصہ بعد اس کے داماد کی جانب سے ایک لفافہ موصول ہوا، جس کے اندر ایک مختصر خط کے ساتھ طلاق نامہ رکھا ہوا تھا۔ محمد صادق پر بجلی گر پڑی، اس کے پاؤں سے زمین سرک گئی۔ ابھی اس کی چار لڑکیاں اپنے ہاتھوں میں مہندی کی خوشبو رچانے کی آس میں بیٹھی تھیں۔ پہلی لڑکی ہی گھر پر بیٹھ گئی تو ان چار لڑکیوں کا کیا بنے گا۔ اب کیا ہوگا۔؟ اس کی دنیا تاریک ہوگئی۔ اس نے بڑی دوڑ دھوپ کی، لوگوں کے ذریعہ پیغامات بھجوائے۔ مگر کچھ نہ بنا۔ تحقیقات سے پتہ چلا کہ اس کا داماد فراڈ تھا۔ اس کا غنڈوں کے گروہ سے تعلق تھا، داداگیری سے اپنا کام چلاتا تھا۔

اس غم نے محمد صادق کو نڈھال کردیا۔ وہ چارپائی پر گر گیا۔ اور جب اٹھا تو اس کے پھیپھڑوں میں تپ دق کے جراثیم جڑ پکڑ چکے تھے۔ اس موذی بیماری نے اس پر دو تین بار شدید حملہ کیا۔ پڑوسیوں نے ہمدردی کا ثبوت دیا۔ اسے ٹی بی سنٹر راولپنڈی سے چیک اپ کرایا گیا۔ ڈاکٹروں نے تصدیق کردی کہ محمد صادق ٹی بی میں مبتلا ہوگیا ہے۔ ابتدا میں پڑوسیوں نے اس سے یہ نہیں بتایا کہ وہ ٹی بی میں مبتلا ہے، اپنے طور پر وہ ہر ماہ کچھ چندہ اکٹھا کرکے اس کے لئے دوائی کا انتظام کردیتے اس دوران میں اس کے گھریلو اخراجات کسی نہ کسی طرح پورے ہوتے رہے، لیکن کب تک، نوبت فاقوں پر پہنچ گئی۔

محمد صادق نے بتایا کہ اس نے اپنے سارے حالات لکھ کر دو مرتبہ وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کو روانہ کرچکا ہے۔ جن کی وصولی کی رسیدیں اس کے پاس موجود ہیں۔ اس نے جولائی ۱۹۷۳ء میں گورنر پنجاب جناب غلام مصطفٰے کھر کو بھی ایک درخواست دی تھی گورنر صاحب نے اسے زبانی یقین دہانی کرائی تھی کہ تمہیں چار دن کے اندر اندر جواب بھیج دیا جائے گا۔ لیکن تاحال وہ جواب کا منتظر ہے۔ محمد صادق نے بتایا کہ راولپنڈی ہی کے عبدالعزیز نے بھوک، بے روزگاری اور بیماری سے تنگ آکر اپنی بیوی بچوں کو ذبح کر ڈالا۔ انہی دنوں میں بھی ان مصائب سے تنگ آکر زندگی سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارہ حاصل کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کونسل مسلم لیگ کے رہنما اور دولت مند چودھری ظہور الٰہی کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ اس معاشرے میں مصائب کے شکار افراد خودکشی نہ کریں، بلکہ وہ میرے پاس آئیں میں ان کی مالی امداد کرکے انہیں معاشرے میں زندہ رکھنے کا حق دلاؤں گا۔" لیکن ہوا یہ کہ چودھری ظہور الٰہی نے اسے گیٹ سے واپس بھگا دیا۔

محمد صادق نے کہا، اس نے وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کو کچھ قرضے کے لئے درخواست دے رکھی ہے، اگر یہ قرضہ مجھے مل جائے تو میں کباڑی مارکیٹ سے کچھ گرم کپڑے خرید کر بچوں کے کپڑے تیار کروں گا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالوں گا۔ ورنہ دوسری جانب میرے لئے مایوسی اور موت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

مائی گڈنس! کیسے والدین سے سابقہ پڑا ہے

قصہ پہلے درویش کا

اے حمید

پہلے درویش نے دوسرے درویش کی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سگریٹ سلگایا اور اپنے قصے کی ابتدا غالباً غالب کے اس شعر سے کی کہ ؎

اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

تینوں درویش اس شعر پر عش عش کرتے ہوتے اٹھے اور پہلے درویش کا سر دھننے لگے۔ پہلے درویش کی پگڑی کھل گئی، اس نے پگڑی باندھتے ہوئے آنکھوں میں آنسو لاکر کہا:۔

"بھائیو! اس غلام کمترین کی داستان بڑی المناک ہے، اس قدر المناک کہ رسالہ "شام سویرا" کے ایڈیٹر نے اسے محض اس لئے چھاپنے سے انکار کر دیا تھا کہ اسے پڑھ کر کاتب کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ میری داستانِ غریب حمزہ ایک ایسے شہر کے ریلوے اسٹیشن سے شروع ہوتی ہے جو ہم سے تھوڑی دور ہمارے اردگرد پھیلا ہوا ہے، میں پہلی مرتبہ اس شہر میں وارد ہوا تو شریف آدمیوں کے لباس میں ملبوس تھا چنانچہ اسٹیشن پر ہی پکڑ لیا گیا اور جیل خانے میں ڈال دیا گیا۔ دوسری مرتبہ میں گرگٹ کے بھیس میں نمودار ہوا تو ریلوے اسٹیشن پر میری خوب آؤبھگت اور جاؤبھگت ہوئی۔ لوگوں نے فرطِ محبت سے میرے گلے میں اتنے ہار ڈالے کہ میرا چہرہ ان میں چھپ گیا اور جب میرا چہرہ چھپ گیا تو ایک آدمی نے فرطِ عقیدت سے مجبور ہو کر میری دونوں جیبیں کاٹیں اور ان میں سے ہوٹلوں بل نکال کر لے گیا۔ ایک اور آدمی ہجوم کو چیرتا ہوا میری طرف بڑھا۔ قریب آکر اس نے اپنے رومال سے میری داہنی مونچھ جھاڑی اور اس پر ایک بوسہ دیا اور جیب سے سموسہ نکال کر کھانے لگا۔

میں نے پوچھا:۔

"بھائی یہ بوسہ اور سموسہ کیا ہوا؟"

اس پر وہ مردِ بدلگام لیکن خوش کلام یوں بولا:۔

"وہی جو غمزہ اور شتر غمزہ ہوتا ہے۔"

میں دماغ ہی دماغ میں اس آدمی کی عقل پر دنگ رہ گیا۔ اتنے میں لوگ مجھے دھکیلتے ہوئے اسٹیشن سے باہر لے آتے۔ باہر آکر ان میں سے ہر ایک نے مجھ سے باری باری مصافحہ کیا اور میرے گلے سے اپنا اپنا ہار اتار کر چلتے بنے ایکا ایکی ایک تانگہ میرے قریب سے گزرا جسے دیکھ کر میرے کندھوں کے طوطے اڑ گئے، اس لئے کہ اس کی پچھلی سیٹ پر ایک لمبے منہ والا گھوڑا حاجیوں والا زرد رومال سر پر باندھے عینک لگائے اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ یا الٰہی

مرٹے نہ جائے دردِ دل ——— یہ میں کون سے شہر میں آگیا ہوں۔

خیر تو میرے بھائیو! میں وہاں سے ایک بازار کی جانب کو چل پڑا۔ ایک جگہ مجھے کچھ بھیڑ نظر آئی۔ پاس جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کتا زمین پر نیم جان سا لیٹا ہے اور اس کی ٹانگ میں سے خون بہہ رہا ہے، پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اسے ایک



وہ بزرگ منہ میں چوسنی کے لئے شہد چوس رہے تھے

آدمی نے کاٹ کھایا ہے، قریب تین چار کتے کھڑے تھے۔ ایک کتے نے کان میں انگلی پھیرتے ہوئے دوسرے کتے سے کہا۔

"اسے فوراً ٹیکے لگوانے چاہئیں!"

اتنا سن کر میں چپکے سے ایک طرف کھسک گیا۔ کیونکہ میرے آس پاس بہت آدمی کھڑے تھے۔

جس بازار سے میں گذر رہا تھا وہ کافی بارونق تھا۔ دونوں طرف کی دکانیں خوبصورت اور آراستہ پیراستہ تھیں۔ چونکہ رمضان شریف کا مہینہ تھا اس لئے لوگ جوق در جوق ریستورانوں میں داخل ہو رہے تھے، ایک بہت بڑے ریستوران کے دروازے پر چھوٹا سا بورڈ لٹک رہا تھا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

"یہ ہوٹل رمضان شریف کے احترام میں بند ہے۔
نوٹ:۔ کھانا کھانے کے لئے پچھلی گلی سے تشریف لائیے۔"

میں ابھی بورڈ پڑھ ہی رہا تھا کہ نزدیکی دکان میں سے دو ننگ دھڑنگ آدمی بھاگتے ہوئے نکلے اور سامنے والی گلی میں گم ہو گئے۔ میں نے غور سے دیکھا تو دکان کی پیشانی پر سرخ الفاظ میں لکھا تھا:۔

"یہاں بھاگتے چوروں کی لنگوٹیاں بکتی ہیں۔"

میں وہاں سے بھاگنے ہی لگا تھا کہ اچانک مجھے اپنی لنگوٹی کا خیال آگیا اور میں پہلے سے بھی زیادہ آہستگی سے چلنے لگا۔ کچھ دور چلنے پر میں نے دیکھا کہ دو آدمی کسی بات پر بڑی گرما گرمی سے جھگڑا کر رہے تھے، ایک آدمی دوسرے سے کہنے لگا۔

"میں تمہاری اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔"

دوسرے آدمی نے بڑی لاپروائی سے کہا:۔

"دیکھ لوں گا جب تم اینٹ سے اینٹ بجاؤ گے۔"

اس پر پہلے آدمی نے آگے بڑھ کر سڑک پر سے دو اینٹیں اٹھائیں اور انہیں ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ بجانے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ جھاڑے اور ایک طرف چل پڑا ایسی بھیڑ کیا تھا، دوسرے لوگ ہاتھ جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ اسی ہجوم میں اچانک ایک کم سن لڑکا ایک بزرگ صورت آدمی کو کان سے پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر نکال لایا اور آنکھیں لال کرتے ہوئے گرجا:۔

"ابّا جان میں نے آپ سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ دوپہر کے وقت گھر سے باہر نہ نکلا کریں، مگر آپ سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔" اس بزرگ صورت آدمی نے منہ لٹکا کر اور کان پیٹتے ہوئے کہا:۔

"بیٹا جان! میں تو زمیندار اخبار لینے آیا تھا۔"

لڑکے نے کان چھوڑ کر اپنی قمیض کا کالر ٹھیک کیا اور کہا:۔

"اب سیدھے گھر جائیے اور اسکول کا سبق یاد کیجئے۔

مائی گڈنس! کیسے والدین سے سابقہ پڑا ہے۔"

میرے ہم شکل اور میرے ہم عقل بھائیو! میں بھائیوں کی دکان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ششدر ہو کر رہ گیا اور وہاں سے جلدی جلدی بھاگ نکلا۔ آگے بڑے چوک کے وسط میں ایک خوبصورت فوارہ لگا تھا جس میں سے پانی ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر باہر اُبل رہا تھا۔ فوارے کے نیچے ایک پرندہ بیٹھا تھا جو اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتا تھا۔ اس کے اوپر ایک اور پرندہ درخت کی شاخ پر بیٹھا تھا۔ ترازو اس کے ہاتھ میں تھا، اور وہ

ایک آدمی نے فرمایا
عقیدت سے مجبور ہو
کر میری دونوں
جیبیں صاف کر دیں!

پلڑوں میں پر ڈالے انہیں تول رہا تھا۔ فوارے کی داہنی جانب میں نے سبز سبز گھاس پر ایک بڑے ہی پیارے اور معصوم صورت گڈے سے بچے کو دیکھا چھوٹے چھوٹے کھلونوں سے کھیل رہا تھا اور خود بخود ہنس رہا تھا۔ بچّہ مجھے اس قدر پیارا لگا کہ میں جو کبھی بچوں کو پیار نہیں کرتا اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے بڑی محبّت سے اس کی ٹھوڑی کو انگلی سے چھوتے ہوتے کہا:۔

"ہیلو بے بی! ہیلو سویٹ بے بی! او ہیلو گڈی! بسکٹ کھاؤ گے؟"

بچّے نے اچانک کھلونے ہاتھ سے رکھ دیئے۔ نیکر کی جیب سے لائبریری فریم والی عینک نکال کر آنکھوں پر لگائی اور مجھے گھورتے ہوئے بھاری آواز میں بولا:۔

"مسٹر! مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرو۔"

اے اللہ کے درویشو! اتنا سننا تھا کہ میری پگڑی اچھل کر مجھ سے دور جا گری، جب میں وہاں سے بھاگنے لگا تو بچّے نے ٹھنڈی آہ بھر کر یہ شعر پڑھا ؎

کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
میں خود "لایا" نہیں "آیا" "گیا" ہوں

میرے حواس ابھی اپنے ٹھکانے پر نہیں آئے تھے میں انہیں ٹھکانے پر لانے کے لئے ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ جب میرے حواس مکمل طور پر جمع ہو گئے تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پاس ہی دستار اور عمامہ پوش ایک بوڑھے بزرگ تشریف فرما ہیں اور کچھ پڑھ رہے ہیں۔ ان کا منہ کتاب نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو ان سب سے ذرا دو دو باتیں ہی کر لیں۔ میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا:۔

"کیوں صاحب آج موسم کیسا ہے؟"

دوسری طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ میں نے کان صاف کرتے ہوئے اپنا سوال پھر دہرایا۔ جواب میں حسبِ سابق خاموشی طاری رہی۔ میرے تیسری مرتبہ

استفسار کرنے پر وہ بزرگ کتاب پرے ہٹا کر مجھے قہر بھری نگاہوں سے گھورنے لگے۔ انہیں دیکھ کر میرے پنچ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کیونکہ وہ بزرگ منہ میں چوسنی لئے جلدی جلدی شہد چوس رہے تھے۔ میں وہاں سے سر پر جوتے رکھ کر بھاگا اور شہر کی سب سے بڑی سڑک پر آ کر دم لیا۔ لیکن یہاں آ کر عجیب ہی تماشا دیکھا۔ چوک میں ٹریفک کا سپاہی بے شمار سائیکل سواروں کے درمیان کھڑا ان کا چالان کر رہا تھا۔ اگرچہ دھوپ کافی روشن تھی پھر بھی ان لوگوں کا محض اس لئے چالان ہو رہا تھا کہ وہ صبح کے وقت بغیر بتی کے سائیکل چلا رہے تھے۔

ایک کوچوان میری پگڑی دیکھ کر تانگہ میرے پاس لا کر بولا:

”داتا کے دربار چلیئے گا جناب۔؟“

میرے انکار پر کوچوان نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

”سرکار پلک جھپکنے میں پہنچا دوں گا۔ پندرہ ہارس پاور کا گھوڑا ہے۔“

میں نے ڈر کر گھوڑے کی طرف دیکھا۔ گھوڑے نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور ناک چڑھا کر بولا۔

”جھوٹ بکتا ہے، میں صرف ایک ہارس پاور ہوں۔“

جوں جوں شام ہو رہی تھی میرے درویش بھائیو! میرے دل کو یہ فکر دامن گیر تھا کہ رات کہاں گزاری جائے گھومتے گھومتے میں شہر کی چار دیواری میں آ گیا۔ یہاں ایک جگہ قوالی ہو رہی تھی۔ طبلے بج رہے تھے اور قوال جھوم جھوم کر یہ دوہا بار بار پڑھ رہے تھے۔ ؎

اک ماجرا سناتا ہوں میں حسن و عشق کا

”لے لی“ کا ایک عاشقِ دیوانہ قیس تھا۔

بعد فنا تھے دونوں کے مرقد جدا جدا

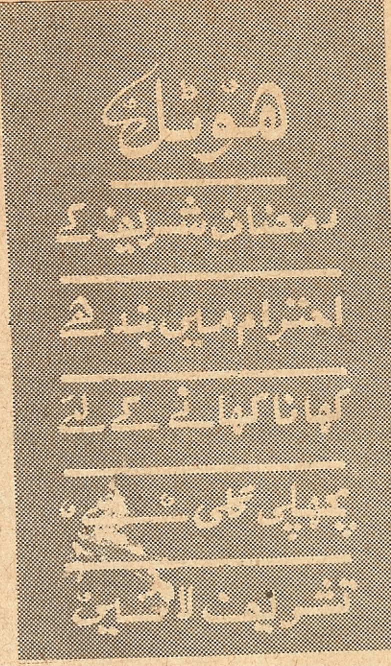
لیکن وہ دونوں قبروں سے آتی تھی یہ صدا

کیا۔؟

تیرے مکھڑے تے کالا کالا تِل وے

وے منڈیا سیالکوٹیا!

پہلے قوال اٹھے تو ایک اور قوال صاحب تشریف لائے جو ٹیلر ماسٹر تھے۔ انہوں نے بیٹھتے ہی گانا شروع کر دیا ؎



میں نے لاکھوں کے کوٹ سیے ستم گر تیرے لئے

اس پہلے ہی مصرع سے لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اٹھ کر ناچنا شروع کر دیا اور اپنے اپنے کوٹ پھاڑ ڈالے، درزی قوال کے شاگرد آگے بڑھے اور آن کی آن میں سارے کوٹ جمع کر کے لے گئے۔ میں نے اپنے کوٹ کے بٹن بند کئے اور آگے چل پڑا۔

”اے میرے پیارے چوتھے درویش! اس سے پیشتر کہ میں کہانی کا آخری حصہ بیان کروں، تو اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں اپنا داہنا ہاتھ ڈال کر بگلے کا ایک سگریٹ نکال کر مجھے پلا تاکہ میرے حواس باطنہ حواسِ خمسہ سے لطف اندوز ہوں!“

اس پر چوتھے درویش نے رونی صورت بناتے ہوئے بگلے کا سگریٹ نکالا اور پہلے درویش کو دیا۔

بگلے کے سگریٹ کا کش کھینچ کر پہلا درویش ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا اور اپنی داستان بیان کرنے لگا:۔

بھائیو! شام ہو چکی تھی۔ میں نے کہیں سے سن رکھا تھا کہ اس شہر میں شام کے وقت خوش حال دستر خوان پر کھانا چن کر مہمانوں کی تلاش میں گلیوں میں چکر لگایا کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی امید میں، میں بھی گلیوں میں گھومنے لگا۔ ایک گلی کا موڑ مڑتے ہوئے اچانک کسی نے میرے منہ پر کپڑا ٹھونسا اور دو آدمی مجھے اٹھا کر کسی پُر اسرار ہوٹل میں لے گئے۔ مجھے کرسی پر بٹھلا کر ایک نے پستول نکال کر باہر رکھ دیا اور باقی دونوں آدمی کرسیاں کھینچ کر میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا:۔

”ہمیں کھانا کھلاؤ یا ہماری گولیاں ٹھنڈی کرو۔“

میں سناٹے میں آ گیا۔ انہوں نے اس دوران میں طرح طرح کے کھانوں کا آرڈر دیا اور کھا پی کر بل میرے حوالے کر کے چلتے بنے۔ میں نے اٹھتے ہوئے بل ہوٹل کے مینیجر کے حوالے کر دیا اور ہوٹل کے مینیجر نے مجھے حوالۂ پولیس کر دیا اور پولیس مجھے حوالات میں لے گئی۔ اتفاق دیکھیے کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ میرے کلاہ میں ایک قیمتی پتھر جڑا ہوا ہے، اسے بیچ کر میں نے جوہری سے ساڑھے گیارہ روپے وصول کئے، پانچ روپے حوالات کے داروغے کو دیئے، پانچ روپے میں ان لوگوں کا بل ادا کیا جو میزبان کی تلاش میں رات کو گلیوں میں گھوما کرتے ہیں اور باقی پیسے جیب میں ڈال کر پاک ٹی ہاؤس میں جا بیٹھا اور چائے پینے لگا۔

میرے بالکل سامنے ایک لمبے ناک والا آدمی پلیٹ میں برف ڈالے اس کے ساتھ روٹی کھا رہا تھا۔ ایک اور آدمی آئس کریم میں کھیرے کے قتلے ڈال کر نوشِ جان کر رہا تھا۔ بچی ہوئی آئس کریم اس نے اپنے بٹوے میں ڈالی، بوٹ کے تسمے کھول کر روپے کا نوٹ نکالا۔ بل پر دستخط کئے اور ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ ایک نوجوان لڑکا چائے کی پیالی سامنے رکھے زار زار رو رہا تھا اور بار بار ایش ٹرے اٹھا کر اس میں آنسوؤں کے قطرے گرا رہا تھا۔ سگریٹ ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ اس نے اسے چائے کے پیالے میں ڈال کر بجھایا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر ایش ٹرے جیب میں ڈال ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ جہاں وہ بیٹھا تھا اس کے عین اوپر لکھا تھا:۔

”براہ مہربانی سگریٹ پیالوں میں مت بجھائیے اور اگر آپ ایسا کرنے پر مجبور ہیں تو بیرے کو کہئے کہ چائے ایش ٹرے میں لائے“

میں اٹھنے ہی والا تھا کہ دو گنجے سروں والے بقراط

باقی صفحہ ۳۱ پر



السٹر یٹیڈ ویکلی آف انڈیا کے مدیر خشونت سنگھ نے اپنے دورۂ پاکستان کے دوران جنرل ٹکا خان کا انٹرویو لیا، اس کے اہم اقتباسات نذرِ قارئین کئے جاتے ہیں (ادارہ)

رن آف کچھ کی لڑائی میں پاکستانی رینجرز نے بھارتی فوجوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا

جنرل ٹکا خاں سے ایک ملاقات — خشونت سنگھ

جنرل ٹکا خان نے کہا، نیازی کے پاس ایک اور ماہ کیلئے گولہ بارود کا ذخیرہ موجود تھا

جنرل ٹکا خان نے ہمارے آدمیوں کے ساتھ پہلی پہلی بار شمشیر آزمائی ۱۹۶۵ء میں رن آف کچھ میں کی" یہ ایک معمولی جھڑپ تھی" انہوں نے کہا "آپ کی بارڈر سیکورٹی فورس سے ہمارے رینجرز نے مقابلہ کیا۔ مختصر سے تصادم کے بعد جنگ بندی ہوگئی۔ اور چند روز بعد ۱۴ جولائی، کو ہماری فوجیں واپس ہوگئیں۔"

پھر ۲۲ روز جنگ ہوئی، جنرل ٹکا خان سیالکوٹ کے انچارج تھے، ان کے مقابلے میں بھارتی جنرل تھاپان اور نورونہ تھے جو ماضی میں ان کے رفقائے کار رہ چکے تھے جنرل ٹکا خان نے کہا "یہ جنگ ایک قسم کے تعطل میں ختم ہوئی، آپ تعداد میں ہم سے تین گنا تھے لیکن ہم اپنے مورچے پر ڈٹے رہے۔"

پاکستانیوں کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے ۱۹۶۵ء

کی جنگ میں کامیابی حاصل کی تھی، "آپ یومِ فتح منا

ہیں"، میں نے کہا "اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ نہ زخمیو

اور جو اسلحہ پکڑا گیا اس کے تناسب سے، نہ مقبوضہ علا

کے اعتبار سے، اکثر غیر ملکی فوجی مبصرین کا کہنا ہے کہ ہ

ہندوستانیوں کو آپ پر برتری حاصل ہوئی تھی"۔

جنرل ٹکا خان نے ایک سپاٹ مسکراہٹ سے میر

جانب دیکھا اور قطعی غیر جذباتی انداز میں جواب دیا: "ہم

کہتے ہیں کہ آپ کا نقصان زیادہ ہوا، اس مؤقف کی ایک

وجہ ہے کہ آپ نے ہم پر حملہ کیا اور حملہ آور کا ہمیشہ زیاد

جانی اور مالی نقصان ہوتا ہے۔"

"علاقوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اور ٹینک

جنگ بندی کا ح

نیازی، بھارتی جنرلوں کے مقابلے میں کچھ نہ کر سکے

اور ہوائی جہاز، ہمارے اعداد و شمار آپ کے اعداد و شمار سے نہیں ملتے۔"

جنرل اپنے موقف پر قائم رہے اور اسی بات کو دُھرایا کہ "ہم کہتے ہیں کہ آپ کا زیادہ نقصان ہوا" اور پھر اتنا ضرور کہا "ہمارے اور آپ کے نقصانات میں اتنا زیادہ فرق نہیں تھا لیکن ہم کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کا زیادہ نقصان کیا" میں نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔

۲۲ روزہ ہند و پاک جنگ کے آخر میں جنرل ٹکا خان کوارٹر ماسٹر جنرل بن گئے۔ اور اپریل ۱۹۶۹ء میں لیفٹیننٹ جنرل، اس موسم گرما میں پہلی بار انہیں میدان سیاست میں داخلے کا موقع ملا۔ جب اگست میں انہیں لاہور میں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا، اور یہاں قریباً وہ دو برس تک رہے پھر مشرقی پاکستان میں لاوا ابلنے لگا۔

سیاسی مفادات نہیں

اس وقت تک جنرل ٹکا خان یہ شہرت حاصل کر چکے تھے کہ جس علاقے میں بھی گڑبڑ ہو وہاں غیر ضروری تشدد کئے بغیر وہ امن و امان بحال کر لیتے ہیں، انہیں اپنے رفقائے کار اور صدر یحییٰ خاں کا اعتماد حاصل تھا، کئی دوسرے سینئر افسروں کی طرح ان کے کوئی سیاسی مفادات نہیں تھے۔ ان پر یہ بھروسہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ سیاست دانوں سے سیاسی کھیل کھیلے بغیر مذاکرات کر سکتے ہیں۔ اس لئے قدرتی طور پر مشرقی پاکستان کے گورنر اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے لئے وہ بہترین انتخاب تھے۔

مشرقی پاکستان کے گورنر کی حیثیت سے تقرری

"یہ شاید پانچ مارچ ۱۹۷۱ء کی بات ہے کہ صدر نے گورنر کے عہدے سے استعفا دے دیا تھا۔ اسی طرح جنرل یعقوب نے بھی، لیکن وہ اب بھی گورنر ہاؤس میں قیام پذیر تھے۔ میں چھاؤنی میں ایک گھر میں چلا گیا۔ میں نے چیف سیکرٹری، پولیس کے انسپکٹر جنرل اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل کی میٹنگ بلائی، مجھے معلوم ہوا کہ صورت حال شہری حکام کے قابو سے باہر ہے، اور شیخ مجیب الرحمان اگلے روز ریس کورس میں ہونے والی میٹنگ میں بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان کرنے والے ہیں۔ چیف سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل پولیس کے مشورے پر میں نے شیخ صاحب سے ملنے کی کوشش کی۔ وہ نہ تو گورنر ہاؤس میں آنے کو تیار تھے۔ اور نہ چھاؤنی میں، انہوں نے کسی تیسری جگہ بھی ملنے سے انکار کر دیا۔ اپنی سیاسی حیثیت قائم رکھنے کے لئے وہ چاہتے تھے کہ میں ان سے ملنے جاؤں۔"

"تاہم انہوں نے آزادی کا اعلان نہ کیا۔ لیکن مجھے معلوم ہوا کہ ان کے آدمی انتشار برپا کر رہے تھے، میں گورنر ہاؤس میں منتقل ہو گیا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ مجیب کو یہاں آنے میں تامل ہے اس لئے میں نے اسے اسمبلی بلڈنگ میں ملنے کا مشورہ دیا مجھے یاد ہے کہ میں نے لکھا تھا کہ "یہ آپ کا مستقبل کا گھر بھی ہوگا۔"

میں نے قطع کلامی کی اور پوچھا "کیا چیف جسٹس نے حلف لینے سے انکار نہیں کیا تھا۔"

"وہ کچھ خوف زدہ تھا، اس نے مجھے ایک تحریر بھجوائی تھی جس میں لکھا تھا کہ ان کی زندگی خطرے میں ہے، تاہم میں گورنر اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے فرائض حلف اٹھائے بغیر ہی انجام دینے لگا۔"

انہوں نے پھر اپنی داستان شروع کی: "۱۲ مارچ کو میں نے یہ خبر جاری کی کہ صدر ڈھاکہ کا دورہ کریں گے۔ تین روز بعد یحییٰ خاں اور مسٹر بھٹو پہنچے۔ اور لیڈروں کے درمیان مذاکرات شروع ہوتے۔"

یحییٰ خاں نے مجھے کراچی میں بلایا ہم نے لمبی ذاتی گفتگو نہیں کی، انہوں نے مجھے فوری طور پر ڈھاکہ پہنچنے کے لئے کہا کیونکہ صورت حال بگڑ رہی تھی"۔ جنرل ٹکا خان نے کہا: "میں نے لاہور میں چارج دیا اور پہلی بیرونی پرواز لی، بیرونی پرواز، کیوں کہ آپ نے اپنے اوپر سے پاکستانی جہازوں کی پرواز روک دی تھی، اور مجھے سیلون سے جانا پڑا۔ ڈھاکہ ائیرپورٹ پر میں ۷ مارچ کی صبح کو اترا۔"

"یہ انتہائی خطرناک صورت حال تھی۔ ایڈمرل احسن

مغربی محاذ پر حقیقی جنگ نہیں ہوئی



"مغربی محاذ کے بارے میں کیا خیال ہے۔؟ آپ کی فوج نے تو ادھر بھی کوئی قابل ذکر مظاہرہ نہیں کیا۔"

"مغربی محاذ!" جنرل نے استفہامیہ انداز میں کہا: "مغربی محاذ پر تو حقیقی جنگ ہوئی ہی نہیں، ہمارے محفوظ دستے جوں کے توں تھے۔ ہماری ہنگامی رجمنٹیں استعمال نہیں کی گئیں۔ یحییٰ خاں کا جنگ بندی کا حکم میری زندگی کا سب سے بڑا صدمہ تھا۔ ہم اور کئی ماہ تک لڑائی جاری رکھ سکتے تھے اور جنگ کو برابر کی شرطوں پر ختم کرتے۔"

م میری زندگی کا سب سے بڑا صدمہ تھا

مَیں، گورنر اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے فرائض حلف اٹھائے بغیر ہی سرانجام دینے لگا!



"میں آپ کے علم میں یہ بات لانا چاہوں گا کہ اس وقت تک ہم نے کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔" جنرل ٹکا خاں نے زور دیتے ہوئے کہا "چھاؤنیوں سے ایک بھی سپاہی باہر نہیں نکلا، ایک یونٹ جو مشرقی پاکستان میں ڈیوٹی پر جانے کے لئے کراچی میں موجود تھا۔ اسے جہاز پر سوار ہونے کی اجازت نہیں دی گئی کہ کہیں اس سے بھی غلط فہمی نہ ہو جائے، چٹاگانگ میں ایک اسلحہ سے بھرا ہوا جہاز کھڑا تھا، بنگالیوں نے اس سے اسلحہ اتارنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے حکم دیا کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ حتیٰ کہ جب سیاسی مذاکرات ناکام بھی ہو گئے۔ میں نے فوجی کارروائی کا حکم نہیں دیا۔"

"یہ صرف اس وقت ایسا ہوا جب مختلف مقامات، کشتیا، پبنہ، چٹاگانگ اور دوسری جگہوں پر ایسٹ پاکستان رائفلز اور مسلح کانسٹیبلری نے بغاوت کر دی، اور اپنے غیر بنگالی افسروں کو ہلاک کر ڈالا۔ بعض جگہ تو ان کے اہلِ خاندان کا بھی قتلِ عام کیا گیا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ مجھے ایک مکمل بغاوت کا سامنا ہے اور میں نے کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔" "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ۲۵ مارچ اور ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کی بدقسمت رات کو واقعات کس ترتیب سے ہوئے۔" میں نے پوچھا۔

۲۵ مارچ کی رات

"ہاں"۔ انہوں نے جواب دیا۔ اور تفصیل سے اپنی یادوں کے ماضی میں جانے کی کوشش کی۔ "میری اطلاع تھی کہ یونیورسٹی جو بند ہے اسے ایسٹ پاکستان رائفلز اور بنگالی پولیس کے باغیوں کے لئے اسلحہ اور گولہ بارود جمع کرنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے، میرے حکم پر ۱۰ بجکر ۳۰ منٹ پر پورے ملک میں بنگالی پولیس کو غیر مسلح کر دیا گیا۔ شام کو میرے آدمیوں نے اسلحہ خانہ پر قبضہ کر لیا جہاں ہتھیار جمع کئے گئے تھے میں نے کارروائی کی ہدایت کی، اور مسلسل ٹیلی فون اور ریڈیو کے ذریعے رابطہ رکھے ہوتے تھے کہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔"

جنرل نے شیخ مجیب الرحمان کی گرفتاری اور ان کی مغربی پاکستان منتقلی کا ذکر نہیں کیا۔

"ملک کے مختلف حصوں میں بڑی شدید لڑائی ہوئی ڈھاکہ میں ہم رات بھر مزاحمت کے اڈوں کی صفائی کرتے رہے۔ صبح تک ہم صورت حال کو ہم اپنے قابو میں لا چکے تھے۔"

"کس قیمت پر۔؟ اخبارات کے مطابق تو آپ نے خون کی ندیاں بہا دی تھیں۔ خاص طور پر یونیورسٹی میں جو کچھ ہوا، اس کی باقاعدہ عینی شہادتیں بھی ہیں۔"

"یہ آپ کے پروپیگنڈہ کرنے والے تھے۔ آپ کا آل انڈیا ریڈیو اور آپ کے اخبارات، اس وقت میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر آپ سچائی سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں تو جو کچھ بھارتی کہیں اسے ۷۰ پر تقسیم کر دیں۔"

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی، میں نے جنرل سے پوچھا۔ "آپ کا ہر اعداد و شمار کو ۷۰ پر تقسیم کرنے سے کیا مطلب ہے؟"

"آپ کے اخبارات کی روشنی میں غیر ملکی اخبارات نے لکھا کہ ڈھاکہ میں ۲۵ اور ۲۶ کی رات کو ۷۰ ہزار افراد ہلاک ہوئے حالانکہ اس رات ہلاک ہونے والوں کی اصل تعداد ۱۰۰ سے کم تھی۔ صحیح تعداد ۹۷ تھی۔ میں نے حکم دیا تھا کہ تمام لاشیں صرف دو ہسپتالوں میں لائی جائیں، ایک میں ۶۶ تھیں اور دوسرے میں ۳۱ یعنی کل ۹۷، چلئے ہم سمجھ لیں کہ دو یا تین کا علم نہیں ہو سکا تھا یا ان کے رشتے دار اٹھا لے گئے۔ اس طرح ۱۰۰ تعداد کر لیں۔ اسے ۷۰ سے ضرب دیجئے تب آپ کو وہ تعداد ملے گی جو بھارتی بتاتے ہیں۔"

"آپ کے اپنے مسکرینہاس۔۔!!۔۔"

"اوہ! مسکرینہاس!" جنرل نے بڑے حقارت بھرے انداز سے ٹھکرایا۔ جیسے کسی بدبو سے وہ اپنے آپ کو بچا رہے ہوں

"آپ کے کتنے آدمی کام آئے۔؟" میں نے پوچھا۔

"ایک ہلاک اور چار زخمی!"

"اس سے معلوم ہوتا تھا کہ کچھ زیادہ مزاحمت نہیں ہوئی!" میں نے کچھ اشارہ کی جسارت کی۔

انہوں نے میری اس ترمیم کو نظرانداز کیا، اور بھارتی اور غیر ملکی اخبارات پر اپنا حملہ جاری رکھا: "آپ کے آل انڈیا ریڈیو نے میری ہلاکت کی خبر نشر کر ڈالی، بی بی سی ٹیلی ویژن نے اس خبر کو اچک لیا۔ میں اسے "کارروائی کی پیشین گوئی" کہتا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ کوئی نہ کوئی مجھے ضرور ہلاک کرے گا۔"

جنرل فاتحانہ انداز میں مسکرائے، میں نے اعتراف کیا کہ آل انڈیا ریڈیو نے واقعی حماقت کی تھی۔

"نہ صرف اس پر بلکہ دوسری ہر چیز پر بھی"۔ جنرل کا اصرار تھا: "انہوں نے لکھا کہ میں نے ہندوؤں کو ہلاک کیا ہے۔ جون میں جب یونیورسٹی دوبارہ کھلی، ۹۷ فی صد اسٹاف جس

حقائق جاننے کیلئے بھارتی اعداد و شمار کو ۷۰ پر تقسیم کر دیں

میں ہندو بھی تھے واپس ڈیوٹی پر آتے۔ آپ کے لوگوں نے مارچ سے لے کر جنگ کے آغاز تک ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۳۰ لاکھ لکھی اور بھارت فرار ہونے والے پناہ گزینوں کی تعداد ایک کروڑ لکھی، مجھے معلوم ہے کہ ۲۶ ہزار سے زیادہ افراد ہلاک نہیں ہوتے اور پناہ گزینوں کی تعداد ۲۵ لاکھ سے کسی صورت زیادہ نہ تھی۔"

میں نے اعداد و شمار پر احتجاج کیا۔ "جنرل صاحب میں نے پناہ گزینوں کی تعداد تو شمار نہیں کی لیکن میں نے لاتعداد کیمپ دیکھے ہیں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ ہمارے اعداد و شمار میں مبالغہ نہ تھا، یہ اعداد و شمار ان راشن کارڈوں کی روشنی میں مرتب کئے گئے تھے جو پناہ گزینوں کو جاری کئے گئے۔ ہم تو ایک سال سے زیادہ عرصہ تک پناہ گزیں ٹیکس ادا کرتے رہے ہیں۔"

جنرل نے یہ دلیل تسلیم نہ کی۔ "میں کارروائی کا انچارج تھا۔ مجھے زیادہ بہتر جاننا چاہیئے۔ میرے اندازوں کی بنیاد تمام اضلاع سے موصول ہونے والی رپورٹوں پر تھی۔ میں نے ہر متاثرہ علاقے کا ہیلی کوپٹر اور کار سے دورہ کیا۔ میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۲۶ ہزار سے زیادہ نہ تھی، ہمارے ۸۰۰۰ ہزار نوجوان کام آئے۔ یہ اتنی بڑی تعداد نہیں ہے، کیونکہ ہم ایک بغاوت کا مقابلہ کر رہے تھے۔"

بہاریوں کا قتل عام

پھر جنرل نے حملے کا رخ میری سمت کر دیا۔ "ہمارے پاس ثبوت موجود ہے کہ بھارتی مداخلت مارچ میں شروع ہو گئی تھی، ہمارے پاس ثبوت ہے کہ بنگالی بہاریوں کا قتل عام کر رہے تھے۔" انہوں نے ایک بوگرہ کے ایک گاؤں سنتا ہار کا نام لیا۔ جہاں ان کے بقول ۱۰ ہزار بہاری مارے گئے تھے۔ "امن بحال کرنے کا ہمارا کام مشکل بنا دیا گیا۔ کیوں کہ آپ کی بارڈر سیکورٹی فورس سرحدوں کو نہ صرف گرم کر رہی تھی بلکہ وہ ہماری سرحدوں میں چھ سات میل اندر گھس بھی آتی تھی۔"

میں نے محسوس کیا کہ اعداد و شمار پر کوئی اتفاق رائے نہیں ہو سکتا، اور جنرل صاحب بھی موضوع کو چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔

من گھڑت کہانیاں

"آپ کے اخبارات نے یہ کہانیاں بھی پھیلائیں کہ



مشرقی بازو کے ۹۰ فی صد
عوام ہمارے خلاف تھے

ہمارے فوجیوں نے ہزاروں بنگالی عورتوں کی بے حرمتی کی ہے اور کتنی ناجائز بچے چھوڑ گئے، مئی کے پورے مہینے میں زنا کے صرف دو کیس رپورٹ کئے گئے، اس کی شکار ملٹری پولیس کی پنجابی عورتیں تھیں۔ دونوں آدمیوں کو سات سال اور تین سال کی سزائیں دی گئیں۔ ستمبر میں جب میں واپس آرہا تھا تو دو مزید رپورٹیں ملیں۔ کل تعداد چار تھی۔ سردار صاحب میں اپنے آدمیوں کو جانتا ہوں۔ میں ان کے ساتھ ۴۰ سال سے ہوں، وہ مذہبی اور خدا ترس آدمی ہیں۔ جو خواتین سے زبردستی کر ہی نہیں سکتے۔ یہ سارا کھیل صرف ہمیں بدنام کرنے کے لیے تھا۔ اگر زنا کی ۳ لاکھ وارداتیں ہوتی ہیں۔ تو وہ تمام بچے کہاں گئے جو ان عورتوں کے تھے۔"

میں نے کہا کہ "بہت سی عورتوں کا اسقاط ہوا ہے بہت سے بچے مدر ٹریسا کی خدمات سے متبنیٰ بنا لئے گئے ہیں۔"

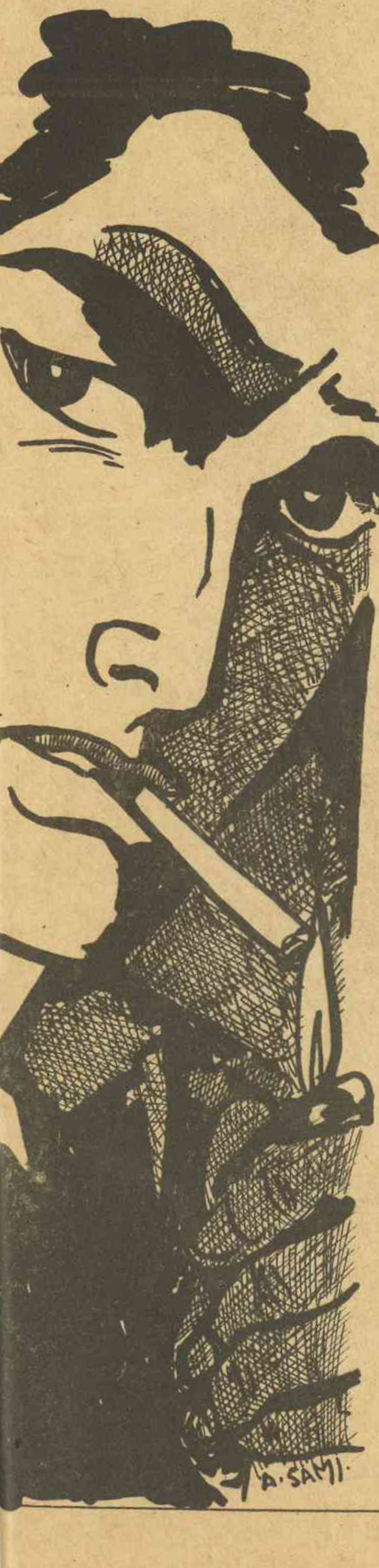
"نہیں، نہیں!" جنرل نے اصرار کیا۔ "یہ سب کچھ اس کھیل کا حصہ تھا۔ جو ہماری فوج کو بدنام کرنے کے لئے کیا گیا۔"

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کی فوج سے بنگالی عوام کیوں نفرت کرنے لگے تھے۔" میں نے پوچھا۔ جنرل کے بقول اس کی وجہ بھارتی پروپیگنڈہ بازوں کی پھیلائی ہوئی جھوٹی کہانیاں تھیں، میں نے اپنی بحث کو بے فائدہ سمجھتے ہوئے موضوع بدلا۔ "جنرل صاحب خواہ آپ میرے اس سوال کا جواب دیں یا نہیں، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کی فوج کی کارکردگی اتنی مایوس کن کیوں رہی۔؟" میں نے انہیں جنرل جگجیت سنگھ اورڑا سے جنگ چھڑنے سے چند ماہ پہلے کے انٹرویو کا حوالہ دیا اور بتایا اورڑا کو بھی توقع نہیں تھی کہ آپ کی فوج اتنی جلدی حوصلہ ہار دے گی۔ کیوں کہ وہ پاکستانی فوج کی عسکری صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے۔ میں نے انہیں پاکستانی اسلحہ اور گولہ بارود کی بہت بڑی مقدار کا بتایا۔ جس پر بھارتیوں نے قبضہ کیا، آخر کیا ہوا۔؟ انہوں نے فائرنگ کیوں نہ کی۔ اور کم از کم ہتھیار ڈالنے سے پہلے گولہ بارود کے ذخائر کو تباہ کیوں نہیں کر دیا۔"

ٹکا خان نے سوال کا جواب نمایاں کرب سے دیا۔ "آپ کے جنرلوں نے ہمیں بے تدبیر کر دیا۔ اس کا اعتراف کرنا چاہیئے، انہوں نے ہماری فوج کو مناسب دفاعی پوزیشنوں سے لڑنے نہ دیا۔ وہ تمام سرحدوں پر دباؤ ڈالتے رہے اور ہمارے یونٹوں کے درمیان رابطے کاٹ دیئے، نیازی ایک جنرل کی حیثیت سے بھارتی جنرلوں کے مقابلے میں کچھ نہ کر سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔"

جنرل نے اتفاق کیا کہ جنرل فضل مقیم خان کی کتاب "پاکستان میں قیادت کا بحران" کا اس سقوط کے سلسلے میں

باقی صفحہ ۳۱ پر





ڈرامہ

کردار

توصیف	بے روزگار تعلیم یافتہ، ذہین نوجوان
انور	توصیف کا آزاد خیال دوست
سیٹھ دولت بخش	ملک کا بہت بڑا تاجر
دلاور	سیٹھ کا خاص ملازم
طرّار	سیٹھ کا ملازم
دیگر	

تحریر: سلیم فاروقی

"پہلا سین"

(ایک پختہ عمر کا شخص جس کا نام توصیف ہے اپنے کمرہ میں میز پر سر ٹکائے بیٹھا ہے دونوں ہاتھ سر پر رکھے ہیں، کمرہ کا سکوت لامتناہی پریشانیوں کا منظر پیش کر رہا ہے میز کی داہنی طرف ایک ایش ٹرے جلی ہوئی سگرٹوں سے بھری رکھی ہے، ایک سگریٹ جو نصف سے زائد پی جا چکی ہے اپنا دھواں فضا میں تحلیل کر رہی ہے میز کے بیچوں بیچ چند کتابیں بے ترتیب حالت میں پڑی ہیں ایک کھلی ہوئی کتاب الٹی رکھی ہے۔ اچانک توصیف ایک آہ سرد لے کر اپنا سر اٹھاتا ہے، اس کی پیشانی پر بکھرے ہوتے بال کسی گہرے تفکر کی نشاندہی کر رہے ہیں ماتھے کی شکنیں رنج والم کی غماز ہیں سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بڑبڑاتا ہے۔)

توصیف:۔ (نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دباتے ہوتے) اُف! میرے پروردگار... آدھی عمر گذر گئی... ایک خواب کی طرح... ناکام... بے کیف... حرماں نصیبی کی حالت میں... مایوسیوں کا اژدھام... بے روزگاری... فاقہ کشی، مصیبتوں کا سیلاب... ایک میری جان ناتواں سے کہتے ہیں... خدا رحیم ہے... ؎

اسے فضل کرتے نہیں لگتی بار

لیکن... ؎

مری بار کیوں دیر اتنی کری

مسلسل ذلتیں... پے بہ پے رسوائیاں... شکست پر شکست... آخر کیوں... میرے خدا ؎

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

(گرخت لہجہ میں)... نہیں! نہیں... یہ سب دھوکا ہے، فریب ہے... یہ سارے افسانے ہیں... ملاؤں کے گھڑے ہوتے... صبر، استقلال، امتحان، آزمائش... وعدہ فردا... ان اصطلاحوں کی حیثیت افیون سے زیادہ نہیں... یہ انسانوں کو سلا دینے والی گولیاں... ہاں! ہاں! خواب آور گولیاں، جمود آمیز... انحطاط انگیز (دھپرا جاتا ہے چونک کر) ارے! یہ میں کیا بک رہا ہوں... استغفراللہ... کلمۂ کفر... اُف! میرے خدا...

(دوبارہ پیشانی کو میز پر ٹیک کر کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے)

"دوسرا سین"

(ایک چھوٹی سی میز کے ارد گرد پانچ پرانی کرسیاں بچھی ہیں، چار کرسیوں پر آدمی بیٹھے ہیں جو چہرے مہرے سے تاجر معلوم ہوتے ہیں۔ پانچویں کرسی خالی ہے، وقفہ وقفہ سے بے ہنگم قہقہے فضا میں بلند ہوتے ہیں، اتنے میں توصیف کمرے میں داخل ہوتا ہے چار آدمی کھڑے ہو جاتے ہیں، توصیف سب سے ہاتھ ملاتا ہے پھر سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں)

توصیف:۔ (اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ایک شخص سے مخاطب ہو کر کہتے) سیٹھ دولت بخش صاحب آپ کے مزاج تو اچھے ہیں۔

سیٹھ:۔ آپ سنائیں جی... کیسی گذر رہی ہے... بہت دنوں سے حضور کا دیدار نہیں ہوا، سوچا شاید ناراض ہوں گے ہم خود ہی سلام کر آئیں۔

توصیف:۔ ذرہ نوازی ہے آپ کی... کچھ دنوں سے شدید قسم کی ذہنی الجھنوں کا شکار ہوں، اس لئے کہیں آنے جانے کو دل نہیں چاہتا۔

سیٹھ:۔ اجی! آپ کو تو ذہنی الجھنوں سے پیار ہو گیا ہے... آپ نے خود انہیں سینہ سے لگا رکھا ہے۔ ہم آپ کو اس لئے نہیں سمجھاتے کہ آپ ہم سے زیادہ سمجھ دار، پڑھے لکھے... اور ذہین آدمی ہیں... ہم افلاطون کو کیا حکمت سکھائیں۔

توصیف:۔ (سگریٹ کا ایک کش لے کر) سیٹھ صاحب! یہ صحیح ہے کہ ؎

پڑھ لئے میں نے علوم شرق و غرب
لیکن... اس کا حاصل؟... کرب... بے چینی...

اذیت... زندگی کا ہر رخ بے چارگی کا آئینہ دار...

سیٹھ:۔ توصیف صاحب! مجھے بار بار اپنی بات دہرانا پڑ رہی ہے کہ مصیبتوں اور دکھوں کی پرورش آپ خود کر رہے ہیں اگر آپ ذرا سا اپنا دل مضبوط کر لیں تو سارے چکر ایک دم میں ختم ہو جائیں، جب آپ سے کوئی کام کی بات کی جاتی ہے تو آپ شیخ سعدی کی گلستاں سنانے لگتے ہیں، آپ کو تو معلوم ہے کہ قول و عمل کی راہیں جُدا جُدا ہوتی ہیں۔ کتابوں کی تعلیمات سے انسان کی عملی زندگی کا بہت کم تعلق ہوتا ہے۔ جو لوگ منبر و محراب پر جلوہ گر ہو کر نیکی اور پاکبازی کا درس دیتے ہیں کیا ان کی عملی زندگی اس سے مطابقت رکھتی ہے؟

> کیا آپ کا ضمیر اس بات کو پسند کرتا ہے کہ آپ کے بچوں کے افلاس زدہ چہروں کو دیکھ کر دوسرے آپ کو غریب سمجھیں آپ کی دق زدہ بیوی سسک سسک کر اور خون تھوک تھوک کر مر جائے۔

آپ اس دن خود ہی یہ شعر سنا رہے تھے ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

توصیف:۔ سیٹھ صاحب... لیکن میں زندگی کی تن آسانیوں کے حصول کی خاطر اپنے ضمیر کا سودا کرنے کو تیار نہیں۔

سیٹھ:۔ (طنزیہ لہجہ میں) ہونہہ!... ضمیر کا سودا... یہ ضمیر کس چڑیا کا نام ہے... کیا آپ کا ضمیر اس بات کو پسند کرتا ہے کہ آپ کے بچوں کے افلاس زدہ چہروں کو دیکھ کر دوسرے آپ کو قابل مستحق سمجھیں... کیا آپ کا ضمیر اس بات پر مطمئن ہے کہ آپ کی تپ دق کی مریضہ بیوی سسک سسک کر اور خون تھوک تھوک کر مر جاتے... کیا آپ کا ضمیر اس بات پر راضی ہے کہ آپ کے گھر میں تین تین وقت چولہا نہ جلے اور اس کا محلہ اور خاندان میں چرچا ہو... کیا آپ کا ضمیر اس سے خوش ہوتا ہے کہ آپ علم اور تجربات کا خزانہ اپنے ذہن میں رکھنے کے باوجود اپنوں اور بیگانوں کے لئے نشانِ عبرت بنیں۔ (مشفقانہ انداز میں) برادرم! خدا کے لئے آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں، دنیا میں لوگ پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ نہ کسی کے صبر و استقلال کی قصیدہ خوانی ہوتی ہے نہ کسی کی قربانی کا ذکر، زمانہ ایک تند و تیز دھارے کی مانند بہتا چلا جا رہا ہے... ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہے، کوئی کسی کو نہیں پوچھتا... چنانچہ ہم تو اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں ؎

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

(توصیف سیٹھ کی باتوں کو سن کر سر جھکا کر کچھ سوچنے لگتا ہے، سیٹھ اپنی چمکدار عقابی آنکھوں سے اسے گھورتا ہے پھر ایک معنی خیز مسکراہٹ کے بعد اپنی جیب سے ایک سو روپیہ کا نوٹ نکال کر توصیف کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے)

سیٹھ:۔ توصیف صاحب... میری جانب سے یہ حقیر سا نذرانہ قبول فرمائیے... میری باتیں یقیناً آپ کو کسی نتیجہ پر پہنچائیں گی وقت سے فائدہ نہ اٹھانا کوئی دانش مندی کی بات نہیں، آپ پرسوں مجھ سے ضرور ملیں۔

(توصیف ایک نظر سیٹھ کے چہرے پر ڈالتا ہے، پھر کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹ لے لیتا ہے اس کے بعد سب رخصت ہوتے ہیں)

"تیسرا سین"

(سیٹھ دولت بخش ایک آرام دہ صوفہ پر بیٹھا ہے، سامنے ایک خوبصورت چھوٹی سی میز بھی ہے جس پر وہسکی کی بوتل اور گلاس رکھا ہے سیٹھ گلاس میں وہسکی انڈیل کر ایک گھونٹ پیتا ہے اتنے میں ایک شخص اندر داخل ہوتا ہے سیٹھ اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہتا ہے آؤ بھئی دلاور کیا خبر لاتے۔)

دلاور:۔ حضور فلم اٹھتی جوانی کے لئے جن نئے چہروں کی ضرورت کا اشتہار دیا تھا اس سلسلہ میں آج آفس میں بہت سی لڑکیاں آئی تھیں۔

سیٹھ:۔ (ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے) ان میں سے ہمارے کام کی کتنی نکلیں۔؟

دلاور:۔ تین لڑکیاں تو بالکل فٹ ہیں۔

سیٹھ:۔ (جماہی لیتے ہوئے) یعنی پڑھی لکھی بھی ہیں؟

دلاور:۔ حضور نہ صرف پڑھی لکھی ہیں بلکہ حسن و دلکشی میں بھی لاجواب۔

سیٹھ:۔ کیوں بھئی! دلاور ہم نے نئی بلبلیں پھانسنے کیلئے کیا جال بُنا ہے۔؟

دلاور:۔ بندہ پرور! آپ تو مہا گرو ہیں ایسی اسکیم تو کسی بقراط کی سمجھ میں بھی نہیں آسکتی۔

ہاں! وہ روئی اور کاغذ کے پرمٹوں کا کیا ہوا۔؟

سیٹھ:۔ بس تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے۔

دلاور:۔ اس کے لئے بڑے صاحب کو کیا نذرانہ پیش کرنا ہوگا۔؟

سیٹھ:۔ (ایک بھونڈا سا قہقہہ لگا کر) بس نئی شراب ورنہ ساقی۔

دلاور:۔ آج جو نئی بلبلیں پھنسی ہیں ان میں ایک تو سراپا قیامت ہے۔ میرے خیال میں بڑے صاحب کے حرم میں اسی شمع کو روشن کیا جاتے۔

سیٹھ:۔ ہاں! ٹھیک ہے (پھر کچھ سوچ کر) آج سے تمہاری تنخواہ میں سو روپے کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

دلاور:۔ سرکار! آپ بڑے غریب نواز ہیں میرے بچے آپ کو دعائیں دیں گے۔

(دلاور سلام کر کے رخصت ہوتا ہے، سیٹھ پھر غرقاب مے و جام ہو جاتا ہے)

"چوتھا سین"

(توصیف اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹا ہے نظریں ٹکٹکی باندھے چھت کو گھور رہی ہیں، چہرہ مضمحل اور اضطراب میں ڈوبا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک تیس سالہ جوان رعنا سوٹ پہنے داخل ہوتا ہے، توصیف اسے دیکھ کر ارے انور تم! کہہ کر اٹھتا ہے اور اس سے بغل گیر ہوتا ہے، دونوں چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

توصیف:۔ کہو یار! کب آئے۔؟

انور:۔ کل رات کی فلائیٹ سے آیا ہوں اور آتے ہی سب سے پہلے تم یاد آئے۔

توصیف:۔ بھئی! میں بھی تمہیں بہت یاد کرتا تھا۔

انور:۔ اسی لئے کبھی میرے خط کا جواب نہیں دیا۔۔۔ خیر سناؤ کیسی گذر رہی ہے۔

توصیف:۔ بے روزگاری شریکِ حیات بنی ہوئی ہے میرے دوست ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

انور:۔ مائی ڈیر! میں تو یہ سمجھا تھا کہ تم شاید شاعرانہ اور فلسفیانہ بھول بھلیوں میں سے نکل کر کچھ کام کے آدمی بن گئے ہو گے، لیکن تمہاری حالت میں سرمو فرق نہیں آیا اگر تم بال بچوں والے نہ ہوتے تو میں تمہیں سمندر میں پھینک دیتا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے یہ بے حسی اپنے اوپر کیوں لاد رکھی ہے، یہی فرق ہے ہماری اور یورپی اقوام کی زندگی میں کہ ابھی تک ہماری قوم نے دنیا میں زندہ رہنے کا طریقہ نہیں سیکھا۔ ہر طرف۔۔۔ یاسیت۔۔۔ محرومی۔۔۔ زندگی سے فرار آخر یہ سب کیوں ہے۔؟

توصیف:۔ بھائی انور! ہم یورپ کے آزاد معاشرے کی تقلید نہیں کر سکتے۔۔۔ زندگی کی ظاہری ٹیپ ٹاپ انسان کو روحانی بلندیوں سے سرفراز نہیں کرتی۔۔۔ یہ درست ہے کہ ہم شکستہ حال ہیں۔۔۔ ہم بے روزگار ہیں۔۔۔ لیکن ہمارا نفس مطمئن ہے۔۔۔ ہمارے ضمیر کی حرمت آج بھی برقرار ہے، اور۔۔۔ یہی ہماری متاع بے بہا ہے۔

انور:۔ تم جس چیز کو روحانی بلندی کہہ رہے ہو اس کا دنیا میں کبھی وجود نہیں رہا۔۔۔ درحقیقت وہ تمہارے ذہن کی پستی ہے۔۔۔ تم ان خوبصورت الفاظ سے اپنے دل کے درد کو نہیں چھپا سکتے، میں تمہارے الجھے ہوتے بالوں میں تمہارے ذہنی دیوالیہ پن کی جھلکیاں دیکھ رہا ہوں۔۔۔ تمہارے ماتھے کی شکنوں میں تمہارے بچوں کی بدنصیبی نمایاں ہے۔۔۔ تمہاری باتوں سے تمہاری تپ دق کی مریضہ بیوی کے خون کی بو آرہی ہے۔۔۔ (چیخ کر) توصیف! تم مجرم ہو۔ بچوں کے مجرم۔۔۔ بیوی کے مجرم۔۔۔ مجرم۔۔۔ مجرم۔۔۔ مجرم۔۔۔

توصیف:۔ تم کچھ کہو مگر مجھے تو حق حلال کی کمائی پسند ہے۔۔۔ میں اپنے نفس کو نیلام کرنا نہیں چاہتا۔۔۔ مجھے وقت کا انتظار ہے۔۔۔ اس وقت کا انتظار۔۔۔ جو میرے خوابوں کی تعبیر بن کر آئے گا۔ (انور بات کاٹ کر)

انور:۔ ہاں! ہاں! وہ وقت قبر کی تاریکیوں میں آئے گا۔۔۔ تمہارے خوابوں کی تعبیر اس دن پوری ہوگی جب تمہاری بیوی اذیت ناک حالت میں دم توڑ کر ہزاروں من مٹی میں دبی ہوگی، تمہاری روح کو اس وقت سکون ہوگا جب تمہارے بچے دنیا میں ناکارہ نکمّے بھٹکتے پھریں گے۔۔۔ دنیا انہیں ذلیل سمجھے گی۔۔۔ انہیں دھتکارے گی۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ تمہارے نام پر تھوکے گی۔

(انور غصہ کے عالم میں اٹھ کر چل دیتا ہے۔ توصیف حیرت سے اسے دیکھتا ہے پھر چارپائی پر لیٹ کر چھت کو گھورنے لگتا ہے)

"پانچواں سین"

(سیٹھ دولت بخش میز پر رکھی ہوئی کچھ فائلوں کو الٹ پھیر رہا ہے، اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی

بجتی ہے۔ سیٹھ رسیور اٹھاتا ہے)
سیٹھ :۔ ہیلو! ہیلو! کون صاحب!... آج... چھا... ضیغم صاحب ہیں... حضور اسلام علیکم... مزاج تو بخیر ہیں نا... جی... پرمٹ کی منظوری ہوگئی... تھینکریہ... تھینکریہ... جی!... جی صاحب! آپ سے کون سی بات چھپی ہے... نیا کام بس شروع ہونے والا ہے... کیا فرمایا! ارے صاحب... توصیف صاحب بڑی مشکل سے ڈھرے پر چڑھے ہیں... جی! پانچسو روپے ایڈوانس دے دیتے ہیں... بجا ارشاد ہے جناب، مفلسی اور بیروزگاری اچھے اچھوں کا تقویٰ توڑ دیتی ہے... جی ہاں!!! جی ہاں!!! خدا حافظ۔

"چھٹا سین"

(سیٹھ دولت بخش، دلاور، طرآر صوفوں پر بیٹھے ہیں)

دلاور :۔ سرکار! آپ کی ہدایت کے مطابق طرآر صاحب نے مشینیں فٹ کرادی ہیں۔ جس بنگلے کے تہہ خانے میں کرنسی چھپے گی اس کے آس پاس کا ماحول بہت پرسکون ہے۔

سیٹھ :۔ (طرآر سے) ہر کام بہت ہوشیاری سے ہونا چاہیئے ہاں! مسٹر توصیف پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہے، ویسے مسٹر دلاور آپ سے تعاون کرتے رہیں گے۔

(گفتگو ختم ہوتی ہے)

"ساتواں سین"

(سیٹھ دولت بخش، دلاور اور طرآر کرسیوں پر بیٹھے ہیں کچھ دیر کی خاموشی کے بعد سیٹھ، دلاور سے۔)

سیٹھ :۔ کرنسی پیٹیوں میں پیک ہو چکی۔؟

دلاور :۔ جی سرکار سب کام ٹھیک ہے۔

سیٹھ :۔ (طرآر سے) توصیف صاحب نے کاغذات مکمل کر لئے۔؟

طرآر :۔ جناب کچھ دیر کے بعد لے کر حاضر ہو جائیں گے۔

سیٹھ :۔ مسٹر رسل کو پیغام پہنچ گیا۔

طرار :۔ جی حضور!

دلاور :۔ جناب کیا یہ مناسب ہے کہ توصیف صاحب کی رہنمائی میں اس مہم کی تکمیل ہو۔؟

سیٹھ :۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ سیٹھ دولت بخش نے کچی گولیاں کھیلی ہیں۔؟ ہم مردم شناس ہیں... اگر بے وقوف ہوتے تو اتنی بڑی حیثیت کے مالک نہ ہوتے... یاد رکھو! اس قسم کا کام بے زبان لوگوں سے لیا جاتا ہے... ہم دولتمند ہیں... ہم عظیم ہیں... ہم اپنی دولت سے... اخلاق... خودداری... اور عزتِ نفس کو خریدتے ہیں۔ ہم دولتمند ہیں، ہم دنیا کے حاکم ہیں... ہم انسان کے حاکم ہیں... ہا! ہا! ہا! ہا! ۔

(سب اٹھ کر چل دیتے ہیں)

"آٹھواں سین"

(توصیف نہایت بے چینی کے عالم میں اپنے کمرے میں ٹہل رہا ہے میز پر پانچ چھ فائلوں

کا بنڈل رکھا ہے، توصیف بار بار اپنی گھڑی میں وقت دیکھتا ہے کچھ دیر اضطراب کے عالم میں ٹہلنے کے بعد آپ ہی آپ بڑبڑاتا ہے)

توصیف :۔ میرے پروردگار... آخر میں کس دنیا میں ہوں... یہ میں کیا کر رہا ہوں... کیا واقعی میرا ذہن مفلوج ہو چکا ہے... کیا میری سوچ جواب دے چکی ہے... کیا میرا ضمیر مر چکا ہے... کیا میرے نفس نے مجھے خرید لیا ہے، اُف! میرے خدا... جرم... اتنا بھیانک جرم!... ملک کے ساتھ... غدّاری... قوم کے ساتھ... سرکشی... اصولوں کے خلاف... بغاوت... قانون کے خلاف... صرف چند کھنکتے سکّوں کے لئے... محض کاغذ کے چند پرزوں کے لئے... ذرا سی تن آسانی کے لئے... چند روزہ عیش و عشرت کے لئے... (چیختے ہوتے) نہیں... نہیں، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا... میں سیٹھ دولت بخش کے ہاتھوں میں کھلونا نہیں بن سکتا۔ وہ رسوا انسان ہے۔ وہ بے حمیّت ہے۔ وہ ضمیر کا سوداگر ہے... وہ نفس فروش ہے... وہ جسموں کا خریدار ہے۔ وہ عزت و ناموس کا بیوپاری ہے۔ دولت کا پجاری ہے... وہ انسان کی شکل میں شیطان ہے۔ میں اپنی بیوی کی میّت دیکھ کر اپنے دل پر پتّھر رکھ سکتا ہوں۔ لیکن۔ قوم و وطن کا مجرم نہیں بن سکتا... میں اپنے بچّوں کو بھوک سے بلبلاتا دیکھ سکتا ہوں۔ مگر۔ اصول فروشی نہیں کر سکتا... میں اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ سکتا ہوں۔ لیکن۔ سماج دشمن عناصر کا آلۂ کار نہیں بن سکتا۔ میں اپنی تمنّاؤں کا خون کر سکتا ہوں۔ مگر اپنی غیرت کو نیلام نہیں کروں گا۔ میں غیر ملکی جعلی کرنسی کا راز فاش کر دوں گا۔ میں غدّاروں کو بے نقاب کر دوں گا۔ میں ضمیر کا سودا ہرگز نہیں کر سکتا۔ میں کسی فریب میں نہیں آؤں گا، میں موت کو اپنے سینہ سے لگا سکتا ہوں۔ مگر۔ ملک و قوم کی عظمت کو پامال نہیں ہونے دوں گا — سیٹھ دولت بخش۔ دولت۔ دولت۔ دولت۔ دولت۔ ہا! ہا! ہا! ہا – ہا! ہا! ہا! ہا!۔ ہا! ہا! ہا! ہا.... ہا! ہا! ہا! ہا۔

(غش کھا کر گر پڑتا ہے۔) — پردہ

غزل

مقبول قریشی

متاعِ حرفِ تسلّی نہ دے کے ٹال مجھے
یہی ہے وقت کہ کرلے شریکِ حال مجھے

یہ ہاتھ چاکِ گریباں کو پھر کریں گے زبوں
دلا رہا ہے ہر ایک لمحہ اشتعال مجھے

مَیں سنگِ راہ ہوں، تقدیر کا لکھا تو نہیں
مثالِ یوسفِ کنعاں کوئیں میں ڈال مجھے

یہ کس دیارِ خموشاں میں لے کے آئی حیات
میری صدا کے توجّہ ذرا اچھال مجھے

دہانِ زخم ابھی تک اُگل رہا ہے لہو!
غبارِ دشت نوردی کبھی اُجال مجھے

چلا ہوں کاسۂ دل لے کے پھر اسی کے حضور
جہاں ہوتی نہ کبھی جراتِ سوال مجھے

پبلو کا خواب ادھورا رہ گیا

فوجیوں نے اس کی کتابیں جلا دیں

الفتح رپورٹ

بیسویں صدی کے عظیم مارکسی لینینی شاعر پبلو نرودا کی لاش اس کے مکان کے ایک شکستہ کمرے میں پڑی تھی اس کی سوگوار بیوی نے لاش کو چاروں طرف پھولوں سے ڈھک دیا تھا۔ ہر طرف روح کو منجمد کر دینے والی خاموشی کا راج تھا۔ یہاں تک کہ بلی کی رونے کی آواز بھی جسم پر لرزہ ڈال دیتی۔ عظیم اور انقلابی شاعر پبلو نرودا۔ خاموشی سے ابدی نیند سو رہا تھا۔ اس نے زندگی بھر پرولتاری اور عوامی انقلاب کے جو گیت گائے تھے وہ پس منظر میں گونج رہے تھے۔

صبح سویرے چلی کے فوجی کھلنڈروں نے اس کے گھر پر دھادا بول دیا تھا۔ پلنگ اور صوفے پھاڑ ڈالے گئے کتابیں، تصویریں اور پوسٹرز جلا دیئے گئے آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں نے گھر سے ملحقہ پائیں باغ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ فوجی آوارہ گردوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس کے مکان کے ایک ایک کمرے کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا۔ کھڑکی کے شیشے توڑ دیئے اور پبلو کی کتابوں پر نشانہ بازی کی مشقیں کیں۔

جس وقت فوجیوں نے پبلو کے گھر پر حملہ کیا۔ اس وقت پبلو ان کے دست برد سے بہت دور جا چکا تھا وہ چلی کے جمہوری اور آئینی صدر الینڈے کے خلاف فوجی ٹولہ کی غداری سے ان کی موت سے بہت دل شکستہ تھا۔ اُسے کینسر کا مرض تھا۔ صدر الینڈے کی موت نے اس کے مرض میں شدت پیدا کر دی وہ غم سے نڈھال ہو گیا۔ صدر الینڈے اور وہ جس معاشرے کی تعمیر میں مصروف تھے۔ اُسے امریکی سامراج کے ایجنٹوں کے اشارے پر چلی کے فوجی ٹولہ نے مسمار کر دیا۔

پبلو نرودا کی بیوہ کا کہنا ہے کہ "دو وہ میاں بیوی" اسی دن میکسیکو جانے والے تھے۔ تمام تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں۔ لیکن پبلو کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔

پبلو صدر الینڈے کے قریبی دوستوں میں تھا۔ اور ایک طرح وہ ان کا ذہنی اور نظریاتی رہنما تھا۔ نئی فوجی جنتا نے بغاوت کر کے آئینی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور چلی میں دہشت گردی کا جو بازار گرم کیا اس سے پبلو کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ اسی صدمہ نے اس کی جان لے لی۔

ایک فوجی ترجمان نے حکومت کی جانب سے اعلان کیا کہ ملک حالت محاصرہ میں ہے۔ لہٰذا پبلو کو قومی اعزاز کے ساتھ دفنایا نہیں جا سکتا۔ فوجی ترجمان نے بالکل درست کہا کہ ایک عظیم شاعر کو قومی اعزاز کے ساتھ دفنایا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ فوج میں ایسی روایت نہ تھی۔ البتہ عظیم شاعر کی لاش کی بے حرمتی ضرور کی جا سکتی تھی۔ جیسا کہ فوجی کھلنڈروں نے عملی طور پر کیا۔

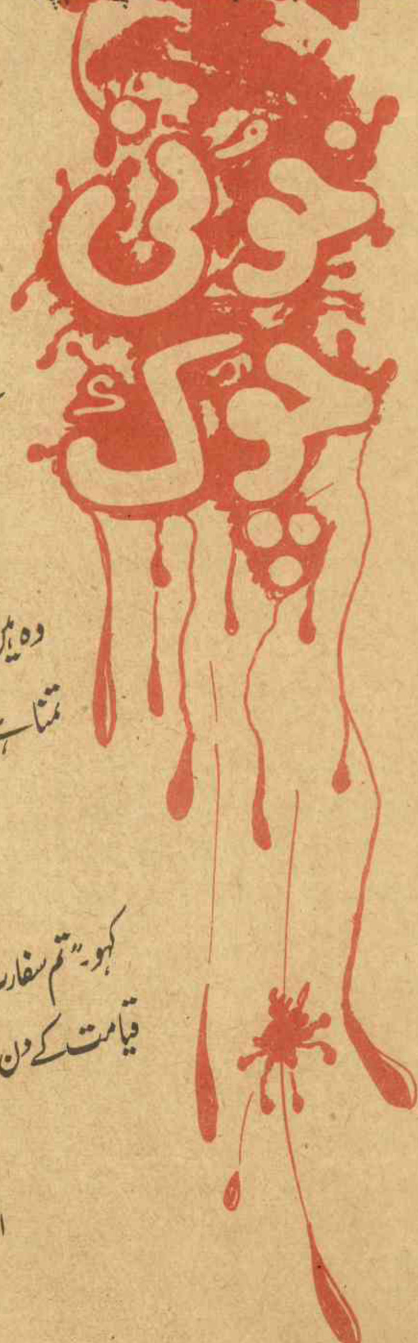
پبلو ایک انقلابی شاعر تھا۔ اسے نوبل پیس پرائز بھی ملا تھا۔ آج اس کی لاش ایک کمرے کے قریب پڑی تھی۔ اس کی بیوی نے اس کی لاش کو پھولوں سے ڈھک دیا تھا۔ لیکن۔ اس کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ پھولوں کے درمیان اس کے چہرے پر وہی خواب منجمد ہو کر رہ گیا جو وہ زندگی بھر دیکھتا آیا تھا۔ ایک نئے اور استحصال سے پاک معاشرے کا خواب۔ جو چلی میں ادھورا رہ گیا۔

بقیہ • احوال واقعی

جو نقصان اٹھانا پڑا ہے اسے وہ امریکہ کی مدد سے پورا کرنا چاہتا ہے۔"

ہو سکتا ہے کہ امریکہ خلیج فارس میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے پاکستان کو اسلحہ فراہم کر دے لیکن امریکی اسلحہ اور امریکی فوجی معاہدوں سے وطن عزیز کا تحفظ نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں ہمیں اس کا تلخ تجربہ ہوا ہے عین وقت پر امریکہ نے اسلحہ کی سپلائی روک دی، اس کے علاوہ یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ امریکی اسلحہ اپنے ساتھ سیاسی اثرات بھی لے کر آئے گا اسی لئے بعض حلقوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ پاکستان کو امریکہ کی گود میں ڈالا جا رہا ہے اگر ماضی کے حکمرانوں جیسی خارجہ پالیسی اختیار کی گئی تو ہم چین کی دوستی سے محروم ہو جائیں گے۔ ایسے دوست سے محروم ہو جائیں گے جس نے فوجی معاہدے نہ ہونے کے باوجود ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ہماری بھرپور مدد کی۔ جس نے ہمارے لئے اپنا ویٹو استعمال کیا اور بنگلہ دیش کو اقوام متحدہ کا رکن نہیں بننے دیا جس نے ابھی تک بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ پاکستانی عوام دل کی گہرائیوں سے چین سے محبت کرتے ہیں۔ چین کے خلوص نے ان کے دلوں پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وزیراعظم بھٹو امریکہ کے دورے سے واپس آئے تو عوام نے "پاک چین دوستی زندہ باد" کے نعروں سے ان کا خیر مقدم کیا۔ اور مسٹر بھٹو کو کہنا پڑا کہ "میں پیکنگ سے نہیں بلکہ واشنگٹن سے آ رہا ہوں" جب جذبات اتنے شدید ہوں تو عوام کی منتخب شدہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ عوام کے جذبات کا احترام کرے اور مغرب کی بجائے مشرق سے اپنے ناطے جوڑے

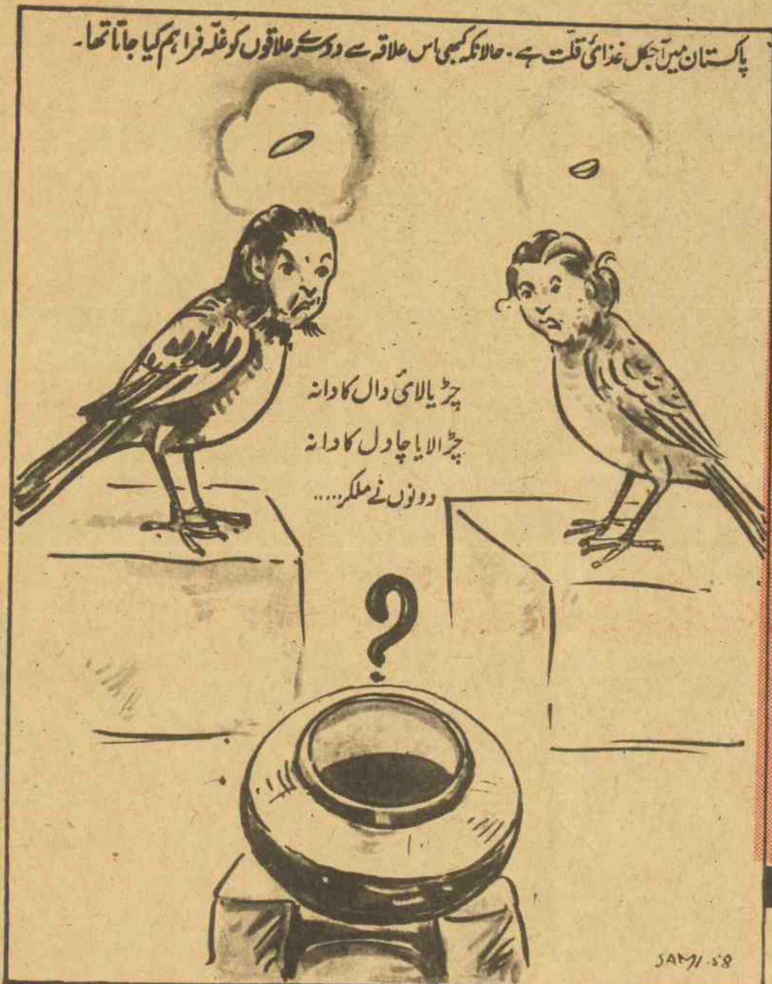
۲۸ جنوری ۱۹۴۶ء میں چلی کے محنت کشوں کے جلسۂ عام پر گولی چلائی گئی تھی۔ ایک سال بعد پیبلو نرودا نے مزدوروں کے عظیم الشان اجتماع کے سامنے اسی چوک میں کھڑے جہاں مزدوروں پر گولی چلی تھی "خونی چوک" نظم پڑھی



پیبلو نرودا

شہیدوں کی روحوں کا ہے استغاثہ، سزا دو! سزا دو!!
یہی عدل و انصاف کا ہے تقاضہ، سزا دو! سزا دو!!
جنھوں نے بہایا لہو اس زمیں پر، اسی چوک میں ان درندوں کو لاکر
سزا دو، سزا دو

ہوا کس کے ایما سے یہ جرم آخر، کیا قتل کا حکم تھا جس نے صادر
اسے بھی اسی چوک میں آج لاکر سزا دو، سزا دو
جو غدّار اوجِ ترقی پہ پہنچے، شہیدوں کی لاشوں کو زینہ بنا کر
انہیں بھی اسی چوک میں آج لاکر سزا دو، سزا دو
وہ ہیں کون ظالم ترحّم کے عادی جنھوں نے نہ ان قاتلوں کو سزا دی؟
تمنا ہے، ان قاتلوں کو بلا کر سزا دو، سزا دو
میں یہ ہاتھ اُن بھیڑیوں سے ملاؤں؟ میں اور اس کھلے ظلم کو بھول جاؤں؟
تمنا ہے ان بھیڑیوں کو بلا کر سزا دو، سزا دو
کہو، "تم سفارت پہ جانے سے پہلے دکھاؤ ہمیں اپنا اعمال نامہ"
قیامت کے دن اور خدا پر نہ چھوڑو، قیامت تو ہے ایک لنگڑا بہانہ
سزا دو سفارت پہ جانے سے پہلے، سزا دو قیامت کے آنے سے پہلے
اسی عرصۂ حشر میں ان کو لاکر سزا دو سزا دو



سمیع آرٹسٹ مرحوم

اُن کا فن زندہ ہے

سمیع سکّہ رائج الوقت تھے لیکن سکّوں سے نفرت کرتے تھے

۲ اکتوبر کو برصغیر پاک و ہند کے عظیم فن کار، کارٹونسٹ سمیع کی برسی منائی جائے گی۔ اس روز سمیع کو لوگ خراجِ عقیدت پیش کریں گے۔ ان میں یقیناً وہ ادارے اور شخصیات شامل نہیں ہوں گے جو ایسے مواقع پر بھی اپنا نفع نقصان دیکھتے ہیں اور جنھیں عظمت کا معیار سرکارِ والا تبار مقرر کر کے دیتی ہے۔ سمیع اپنی زندگی میں اُن کے محتاج نہیں رہے اور نہ ہی مرنے کے بعد یہ ادارے اور شخصیات اُنھیں کچھ دے سکتے ہیں۔ سمیع کو اُن کے فن نے عظیم بنایا۔ اور یہی فن اُن کی عظمت کی نشاندہی کرتا رہے گا۔

سمیع کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ انھوں نے برطانوی سامراج کے خلاف لڑنے والے ہراول دستے کے حریت پسند مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ کام کیا۔ "کامریڈ" کے



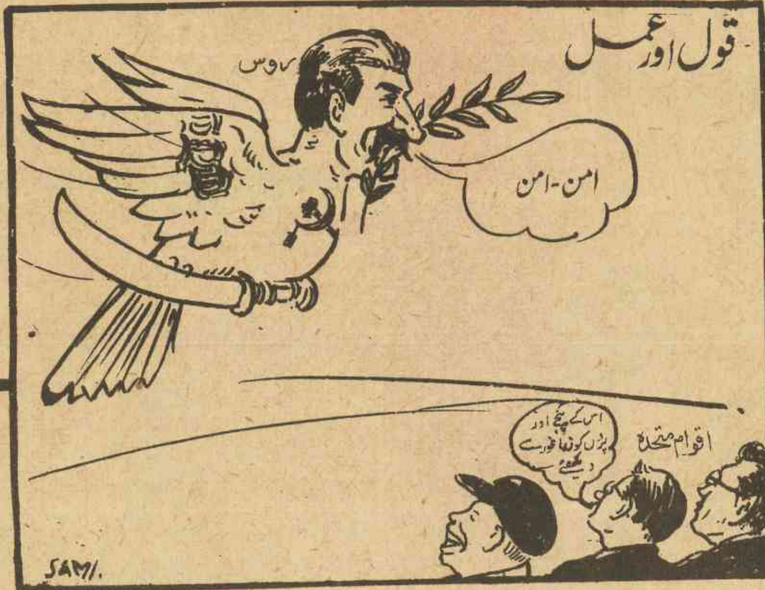
صفحات آج بھی اس امر کے گواہ ہیں کہ سمیع بھی اس حریت پسند دستے کا ایک اہم کارکن تھا۔ جو اپنے قلم کے نشتروں سے برطانوی سامراج پر حملہ آور ہوتا تو چھکے چھڑا دیتا۔ وہ اپنے قارئین کو ایک نیا عزم اور ولولہ دیتا۔

سمیع عوام کی آواز تھے۔ ایک دانشور کی حیثیت سے انھوں نے اپنی ذمہ داریاں باحسن طور پر انجام دیں عوام کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے خبردار کیا۔ وہ لوگ جو رہنما بنے ہوتے تھے۔ اُن کی شخصیت کے اسیر نہ ہوتے بلکہ جس کسی نے بھی عوام دشمنی سے کام لیا۔ اس کو بے نقاب کرتے رہے۔

ایک طرف یہ عالم تھا اور دوسری طرف اُن کی

مقبولیت۔ اخباری صنعت والوں نے انھیں سکۂ رائج الوقت سمجھ لیا تھا۔ سمیع صاحب اپنی حیثیت سے بے خبر نہ تھے۔ اس صورت میں بھی انہوں نے عوام کا ساتھ دیا۔ اور زر کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔

اس سماج نے اپنے روایتی اور تاریخی کردار کے پیشِ نظر سمیع سے انصاف نہیں کیا۔ عوام دوست طاقتوں کو اس سے انصاف کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے۔ سمیع وفات پا چکے ہیں لیکن اُن کا فن زندہ ہے



سمیع آرٹسٹ، پاکستان کے ممتاز ناقد مجتبیٰ حسین کی نظر میں

سمیع مرحوم کی تخلیقات مُلک کا سرمایہ ہے

ایک سوال جس پر ان تمام لوگوں کو غور کرنے کی ضرورت ہے جنھیں تہذیبی زندگی سے دلچسپی ہے اور مہذب بن کر جینا چاہتے ہیں۔ یہ ہے کہ فن کار سے ہمیں کیا ملتا ہے اور ہم فن کار کو کیا دیتے ہیں؟ یوں سمجھئے کہ معاشرے کے ذہنی ارتقا میں فن کار کا کتنا حصہ ہے!؟

وہ لوگ جنھیں ادب اور آرٹ سے دلچسپی ہے اس کا جواب غالباً یہی دیں گے کہ فن کاروں کے بغیر یہ معاشرہ بالکل اس کچی مٹی کی طرح ہوتا ہے۔ جسے کمہار نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔

سمیع مرحوم ہمارے دور کے بڑے باکمال نکتہ رس، روشن فکر اور مسائل شناس فن کار تھے۔ ان کی شہرت اس برصغیر میں ایک کارٹونسٹ کی حیثیت سے ہوئی۔ ان کے فن کی ابتدا کامریڈ سے ہوئی۔ پھر ملک کے مشہور جریدے ان کی فنکاری سے جلا پاتے رہے پاکستان آنے کے بعد بھی ان کا فن مختلف روزناموں کو مسائل حاضرہ کی بصیرت بخشتا رہا۔

"کارٹون سازی" نہایت مشکل فن ہے، یہ صرف "ہاتھ کی صفائی" نہیں قلب کی صفائی چاہتا ہے کدورت اور نفرت پروری کے جذبے کے تحت، کارٹون خود اپنے صانع کا کارٹون بن جاتا ہے۔ اصل میں کارٹون اس وقت تک وجود میں آ ہی نہیں سکتے جب تک کہ فنکار زندگی کے الجھے ہوئے مسائل کو سمجھ کر دیکھنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ وہ ہوتا ہے جب وہ ان الجھے ہوئے اور بسا اوقات متصادم مسائل کو انسانوں کی شکل میں جیتا جاگتا، چلتا پھرتا منہ سے بولتا ہوا دیکھتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جب فن کار خود ان انسانوں میں شامل ہو جاتا ہے جو نفرت اور محبت کے درمیان اب تک زندگی کا سفر طے کر رہے ہیں۔ یہاں فنکار زندگی کو سمیٹ لیتا ہے اور پھر ان دکھوں کو کبھی ایک قہقہے کبھی ایک تبسم میں ڈھال کر ہمارے غموں کو ہلکا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ہم میں زندگی کے نیک اور بد پہلوؤں میں امتیاز کرنے کا شعور بیدار کرتا ہے۔

> انہوں نے عوام میں زندگی کے نیک اور بد میں امتیاز کرنے کا شعور پیدا کیا

سمیع مرحوم دردمندی کی اس دولت سے مالامال تھے۔ ان کے موقلم نے بے شمار کارٹونوں کی وساطت سے ہمیں ہنسایا ہے۔ ہمارے دکھوں کو یکجا کیا ہے، ہم میں مسائل حاضرہ سے باخبری پیدا کی ہے اور اس طرح ہمیں مہذب اور باشعور بنایا ہے

لیکن خود انہیں کیا ملا؟ وہ اپنے درد کو سمیٹے ہوئے چلے گئے اور ہمیں خوشیوں کے چند لمحے دے گئے۔ ان کے معاشرے نے انہیں اگر بھلایا نہیں تو یاد بھی نہیں رکھا۔ اس طرح جس طرح یاد رکھنا چاہئے تھا۔ شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سمیع مرحوم کی یادگار تخلیقات کو ملک کی متاع گراں مایہ سمجھ کر محفوظ کریں اور ان کے کارناموں کا اعتراف کریں یہ سمیع مرحوم پر کوئی احسان نہیں ہو گا بلکہ اس بات کا ثبوت ہو گا کہ ہم غیر مہذب نہیں ہیں اپنے ورثے کی قدر کرنا جانتے ہیں۔

خٹک صاحب
باہر بیٹھ کر
دوست ملک کے
خلاف بیان دینا
آپ ہی کو
زیب دیتا ہے

ہم پاکستان کے ساتھ جئیں گے
اور پاکستان کے ساتھ مریں گے

اگر محبِ وطن ہونا جرم ہے تو ہم یہ جرم کرتے رہیں گے

نسیم بلتستانی

اجمل خٹک کا انٹرویو، جو الفتح کے شمارہ ۱۳ تا ۲۰ ستمبر ۷۳ء میں شائع ہوا نظر سے گزرا۔ اس میں اجمل خٹک نے ہمارے دوست ملک چین پر الزام لگایا کہ وہ گلگت اور بلتستان پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اجمل خٹک بلتستان اور گلگت کی تاریخ سے نابلد ہیں اور اس کی جغرافیائی حدود سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ اگر انہیں خود ساختہ جلاوطنی اختیار کرکے بیان بازی کا شوق پورا کرنا ہے یا بے سروپا بیانات جاری کرکے حقِ نمک ادا کرنا مقصود ہے تو کم از کم بلتستان و گلگت کے عوام پر رحم و کرم کرتے چلیے۔ یہاں کے سادہ لوح عوام کی توہین نہ کریں۔ اگر بلتستان و گلگت کے عوام نے آپ کے پختونستان کے فضول و بے کار نعرہ کا ساتھ نہ دیا تو کون سا گناہ کردیا۔ پختونستان بیمار اور مایوس ذہن کی تخلیق ہے۔ بلتستان و گلگت کے عوام کبھی بھی اس مفروضہ تحریک کی حمایت کرنے کی حماقت نہ کریں گے۔ وہاں کے عوام محبِ وطن پاکستانی ہیں۔ خدارا ہمیں صرف یہ ایک جرم کرنے دیں۔ ہم نے اس کے تمام رنگ و نسل کے اثرات کو چھپا کر سینے سے لگایا ہے۔ اب ہم اس کے ہیں اور یہ ہمارا ہے۔ ہماری بقا اس کی بقا کے ساتھ ہے۔ اگر اس کی فنا ہی آپ لوگوں کے ہاتھوں مقدر ہو چکی ہے تو ہم اس کے ساتھ فنا ہو جائیں گے۔ لیکن اس کے علاوہ کسی تحریک میں حصہ نہیں لیں گے۔ آپ جو دھمکی دینا چاہیں، دے دیں۔ جیسا ڈرانا چاہیں ڈرالیں۔ لیکن ہم پاکستانی ہیں، پاکستانی رہیں گے۔ بلتستان و گلگت کے عوام نے پاکستان میں شمولیت ریفرنڈم کے ذریعے نہیں کی ہے۔ نہ کسی ملک سے ڈر کر کی ہے، اور نہ ہی کسی کے دباؤ کے تحت اختیار کی ہے بلکہ ہم خود آزادانہ طور پر شریک ہوئے ہیں۔ کسی قسم کی بیرونی امداد کے بغیر ڈوگرہ حکومت کی طرف سے مسلط کردہ گورنر بریگیڈیر گھنسارہ سنگھ کو اور ڈوگرہ بھارتی کے جدید اسلحہ سے مسلح فوج کو پے در پے شکست دیکر پسپا ہی نہیں کیا بلکہ ہمارے جیالے مجاہد سرینگر کی دہلیز پر دستک دے رہے تھے۔ جنگ بندی کے اعلان کے باوجود ہماری جنگ جاری تھی۔ چونکہ کسی ملک کے قانون کے پابند نہیں ہیں کوئی ملک ہم پر حکم نہیں چلا سکتا تھا ہم آزاد تھے ہم اس دوران جہاں چاہتے اور جس ملک کو بہتر سمجھتے اس میں شامل ہونے سے ہمیں باز رکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ لیکن بلتستان و گلگت کے اسلام دوست عوام نے پاکستان میں شمولیت کر کے آزادانہ اعلان کرکے اسلام دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ چونکہ اس وطنِ عزیز کی بنیادیں کلمہ طیبہ پر رکھی گئی تھیں۔ ہم چاہتے تو چین میں اسی وقت شامل ہو سکتے تھے۔ ہم تبت کو ترجیح دے سکتے تھے۔ چونکہ ہم اور چین کے عوام ایک ہی رنگ و نسل کے ہیں ہماری تہذیب، ثقافت اور لسان ہم آہنگ ہیں۔ ہمارا یہ ۲۵ سالہ تجربہ ہے کہ پاکستانی حکمرانوں نے پاکستان میں شمولیت کے جرم میں اس خداکی بستی پر وہ وہ ظلم و تشدد کئے کہ ڈوگرہ و انگریز ظلم بھی شرما گیا۔ ہمیں غدار سمجھ کر ایف۔ سی۔ آر جیسے رسوائے زمانہ قانون مسلط کر دیئے۔ انگریزوں نے تو صرف ۱۴۸۰ مربع میل کی پٹی پر ایف سی آر نافذ کیا تھا۔ ہمارے بھائیوں نے تیس ہزار مربع میل پر ایجنسی نظام قائم کر دیا۔ انگریزوں نے اس رسوائے زمانہ نظام کو روس میں پرولتاریہ انقلاب کے بعد برصغیر میں اس تحریک کے اثرات کو روکنے کے لئے اور دفاعی لائن مقرر کرنے کی غرض سے یہ نظام قائم کیا تھا۔ لیکن ہمیں آج تک علم نہ ہوا کہ پاکستان کے حکمرانوں نے یہ طوق ہماری گردن میں کیوں آویزاں کیا تھا۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن ہماری "پاکستانیت" غیر متزلزل رہی۔ ہم اس امید پر اس وطن سے وابستہ رہے کہ ایک نہ ایک دن عدل و انصاف کا سورج طلوع ہوگا۔ سماجی انصاف کا بول بالا ہوگا۔ ہم مایوس نہیں ہیں۔ ہم اس عوامی دور پر یقین رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ایف سی آر کا طوق ہماری ناتواں گردن سے اتار پھینکا ہے اسی طرح وہاں کے دیگر مسائل کا حل بھی ڈھونڈ نکالا جائے گا۔ ہم پُرامید ہیں ہم جلاوطنی اختیار کرنے کی عیاشی نہیں کریں گے۔ اور نہ کسی غیر ملک کی دلالی ہمارا شیوہ ہے۔ ہم نے یہ آزادی دو صدیوں کی جدوجہد کے بعد حاصل کی ہے۔ ہم نے ڈوگرہ، بھارتی جدید اسلحہ سے لیس ہزاروں کی تعداد میں فوج کا مقابلہ ڈنڈوں کلہاڑیوں اور تلواروں کے ساتھ کرکے پسپا کیا ہے۔ ہم ان سپوتوں کو فراموش نہیں کر سکتے جن کے سینے میں لکڑی کی کیلیں پیوست کرکے شہید کر دیا گیا۔ ہم ان کے خون کو رائیگاں نہیں جانے دیں گے جنھوں نے اس ارادہ کی خاطر اپنی آنکھوں میں گرم گرم تپتے ہوئے لوہے کی سلاخیں برداشت کیں اور اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ہم ان بہادروں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے جنھوں نے اذیتیں برداشت کرکے آج کی آزادی کی بنیاد ڈالی ہے۔ ہماری جنگ جاری ہے اور آج بھی حق و انصاف کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ آج بھی اپنے حقوق کی بحالی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اب ہماری جنگ کسی استبدادی قوت سے نہیں ہے۔ بلکہ سامراجی نظام سے ہے۔ اور ان عوامل سے جو گزشتہ برسوں کی غیر عوامی، جمہوری قوتوں نے ہم پر مسلط کی ہے۔ انشاء اللہ ہم اس عوامی دور میں ان عوامل کا پوسٹ مارٹم کرکے صحت مند خوشحال معاشرہ کی جانب قدم بڑھائینگے۔

بلتستان و گلگت کے عوام کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ اس وطنِ عزیز کا کون صدر یا وزیر اعظم ہے۔

جاہیے۔ ذوالفقار علی بھٹو بن جائے یا ولی خان یا کوئی بندو خان
...ین پاکستانی اور پاکستانی نظریہ کا حامل ہونا شرط ضروری ہے۔ اس وطن عزیز کا سربراہ کسی ایسے شخص کو کبھی پسند نہیں کرینگے جس کی پارٹی کا جنم بھومی غیر علاقہ میں ہوا اور اس کا ایک اعلیٰ عہدیدار حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے بھگوڑا ہو جائے۔ زندگی بھر سیاسی اور اخلاقی کوڑھ میں مبتلا رہا ہو اور اب اس موذی مرض کو ملک کے نوجوانوں میں پھیلا رہا ہو اور وطن کے دوست ممالک کے خلاف مذموم بیانات دے رہا ہو۔ چین کے عوام ہمارے دوست ہیں۔ ہمارے کٹھن وقت میں ہمیشہ ہماری حمایت میں نکل پڑا ہے۔ توسیع پسندی اس ملک کے عوام کا شیوہ نہیں ہے بلتستان و گلگت کے عوام پر گزشتہ برسوں میں جو ظلم و ستم روا رکھا گیا تھا، اس دوران اگر چین چاہتا تو فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن چین نے ایسا نہیں کیا۔ اب یہ بے بنیاد الزام لگا کر ہمارے دوستوں کو بدظن کرنے کے علاوہ ملک کی کوئی خدمت نہیں ہے۔

دلالی میں منہ کالا تو ہو سکتا ہے لیکن اس میں حقیقت کچھ نہیں ہے۔ یہ بلتستان و گلگت کے عوام کی بدقسمتی ہے کہ آج تک اس علاقہ کے صحیح نمائندوں کو قومی پریس نے بخل سے کام لے کر منظرِ عام پر نہ آنے دیا۔ وہ اپنا اور اپنے عوام کے صحیح جذبات کی ترجمانی نہ کر سکے۔ اپنا عندیہ عوام الناس کے سامنے پیش نہ کر سکے۔ سیاسی دلالوں کو قومی پریس نے اتنا اچھالا کہ انہوں نے وہاں کے عوام کے خدوخال کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ یہ سیاسی دلال اور عوامی مسخرے خود بھی بلتستان و گلگت کی جغرافیائی تاریخی، معاشی، اقتصادی، ثقافتی اور قبائلی طرز کی بود و باش اور غیرت سے نابلد تھے۔ خدارا مجھے اجازت دیں کہ میں وہاں کی تاریخ و جغرافیہ کو پیش کر کے ان سیاسی و اخلاقی ناسوروں کا اپریشن کروں۔

بلتستان

کوہ قراقرم کی شاخوں پر بلتستان ایک آشیانہ کی مانند قائم ہے۔ اسکردو صدر مقام ہے، اس کے کچھ فاصلے پر دریائے شگر عبور کر کے شگر کی ایک سو پچاس میل لمبی سرسبز و شاداب وادی واقع ہے جس کے بارے میں ایک یورپی سیاح نے پاکستان کا بلجیم قرار دیا تھا۔ یہ وادی بلتستان کا "ان داتا" ہے۔ اس وادی کی خوشحالی کا ثبوت یہ ہے کہ پورے بلتستان کے مالیہ کا ۶۰ فیصد حصّہ صرف یہ وادی ادا کرتی ہے۔ دریا شگر پاکستان میں داخل ہونے پر دریائے سندھ کہلاتا ہے۔ یہ دریائے اولڈ ٹنگ تھنگ سے گزر کر "مرول" (MORUL) دریا کے کنارے بالائی حصّہ کھرمنگ کہلاتا ہے۔ بائیں جانب کرگل اور زوجی لا کے علاقے واقع ہیں۔ کرگل کے بالکل مشرق میں زنسکار کا علاقہ ہے جس کی حدود نیچے کشتواڑ سے ملتی ہے۔ بائیں جانب دراس کا علاقہ صوبہ کشمیر کی حدود سے ملتا ہے۔ سندھ کا دایاں بالائی علاقہ جو ایک صد میل لمبی مگر تنگ وادی کی شکل میں ہے۔ مرکزی لداخ اور بائیں جانب کے تمام علاقے تحصیل کرگل اور زنسکار تحصیل وغیرہ واقع ہیں۔ اس کے علاوہ بلتستان کے وسیع و عریض علاقہ میں روندو، اسکول، ہشر پکوتہ، کیسال سور واور خلپو کے علاقے بھی شامل ہیں۔

حدودِ اربع

بلتستان کے شمال مشرق کی جانب عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ وادی ڈپسانگ اور اس سے ملحقہ وادی سوداکا آخری شہر حاجی لنگر واقع ہے۔ مشرق میں تبت کی حدود کے نزدیک اور علاقہ چنگ چینیم کے مشہور مقام پمزل، شمال میں روس کا سوشل سامراج براجمان ہے۔ جنوب میں رام راج اسیاسی منڈل (مقبوضہ کشمیر) میں دھونی جمائے بیٹھا ہے۔ مغرب میں روس کا حاشیہ بردار بھارت کا کاسہ لیس، اور پاکستان کے جعفر و صادقوں کی پناہ گاہ اور پختونستان جیسے مفروضہ نعروں کی کوکھ افغانستان واقع ہے۔ بلتستان کا کل رقبہ ۴۵۷۶۲ مربع میل ہے۔

گلگت

زمانہ قدیم میں اس کا نام گلِت تھا۔ سکھ حکومت کی عملداری میں آنے کے بعد اس کا نام گلگت ہو گیا، اس کا کل رقبہ ۱۷۷۹۲ مربع میل ہے۔ شمال میں کوہستان ہمالیہ کے بلند پشت کنارے تک اس کی حد ہے۔ شمال مشرق میں کوہستانِ قراقرم جس خط سے پانی دائیں طرف جاتا ہے وہ علاقہ بلتستان کا شروع ہوتا ہے، اور مغرب کی طرف آتا ہے وہ گلگت میں شمار ہوتا ہے یعنی مرکز میں گلگت کی وادی، شمال مشرق میں نگر و ہنزہ کی وادیاں شمال مغرب میں اشکومن، مغرب میں یونیال اور اس کے ساتھ یاسین گوپس کے علاقے جنوب مغربی کونے میں داریل اور تنگیر، جنوب میں چیلاس اور جنوب مشرق میں دورتک استور کی وادیاں ہیں۔

تاریخی ارتقاء

بلتستان و گلگت کے علاقوں کی صدیوں کی مشترک تہذیب و تاریخ ان کی پشت پر ہے۔ قدیم دور میں ہر وادی کی اپنی ننھی سی دنیا تھی۔ آبادی کا تناسب کم تھا۔ زندگی انتہا سادہ، لڑائی فساد، چوری فریب اور جھوٹ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ پولیس یا فوج کی ضرورت نہ تھی۔ کوئی راجہ نہ تھا۔ ہر گھر کا سب سے بڑا رکن حاکمِ اعلیٰ تھا۔ جب آپس کے جھگڑے شروع ہوئے تو ایک قبائلی سردار مقرر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس طرح بہت سے قبائلی کمیون کے سربراہ جسے بلتی زبان میں ترانکیہ کہتے ہیں، مشورہ سے ایک اجتماعی قبائلی سردار مقرر کرتے جسے راجہ یا "یبو" کہتے تھے۔ بعد میں راجہ گری کے جھگڑے شروع ہوتے۔ ایک سردار دوسرے سردار پر لشکر کشی کرتا رہتا تھا۔ سردار مقامی سطح پر حکومت کرتے تھے۔ ۸۵۰ھ میں صوفی سید محمد نور بخش رح کشمیر سے بلتستان تشریف لائے۔ اس وقت کے شگر کے راجہ غازی میر ۱۴۵۰ء سے ۱۴۷۰ء، اور خلپو کے راجہ شاہِ اعظم ۱۴۴۰ء سے ۱۴۷۰ء میں پیر سید صاحب کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ جس کے بعد مختلف علاقوں میں اسلام بڑھتا گیا۔ اسکردو کے راجہ علی شیر خاق انچن نے گلگت کے راجہ مرزا خان پر حملہ کر کے اپنی فرمانروائی میں شامل کر دیا۔ راجہ علی شیر خان کے پوتوں، راجہ شیر شاہ، علی شاہ اور شاہ مراد نے بھی گلگت سے باجگزاری حاصل کی تھی۔ بسنہ ۱۵۸۶ء سے ۱۸۳۴ء تک بلتستان و گلگت کا علاقہ ایک آزاد سلطنت کی حیثیت سے قائم رہا۔ چاروں جانب کی یورش اور حملوں کا مقابلہ کرتا رہا لیکن ۱۸۳۴ء میں گلاب سنگھ چند مفاد پرست اور وطن دشمن عناصر کو توڑنے میں کامیاب رہا جن کی رہنمائی اور مدد سے کرنل نہرا اور سنگھ کی سرکردگی میں زبردست فوجی